Monthly **AWAMI JAMHURIAT**

عوامی جمہوریت

ماہنامہ جنوری تا مارچ 2019ء

☆

اشاعت کا
50 واں سال

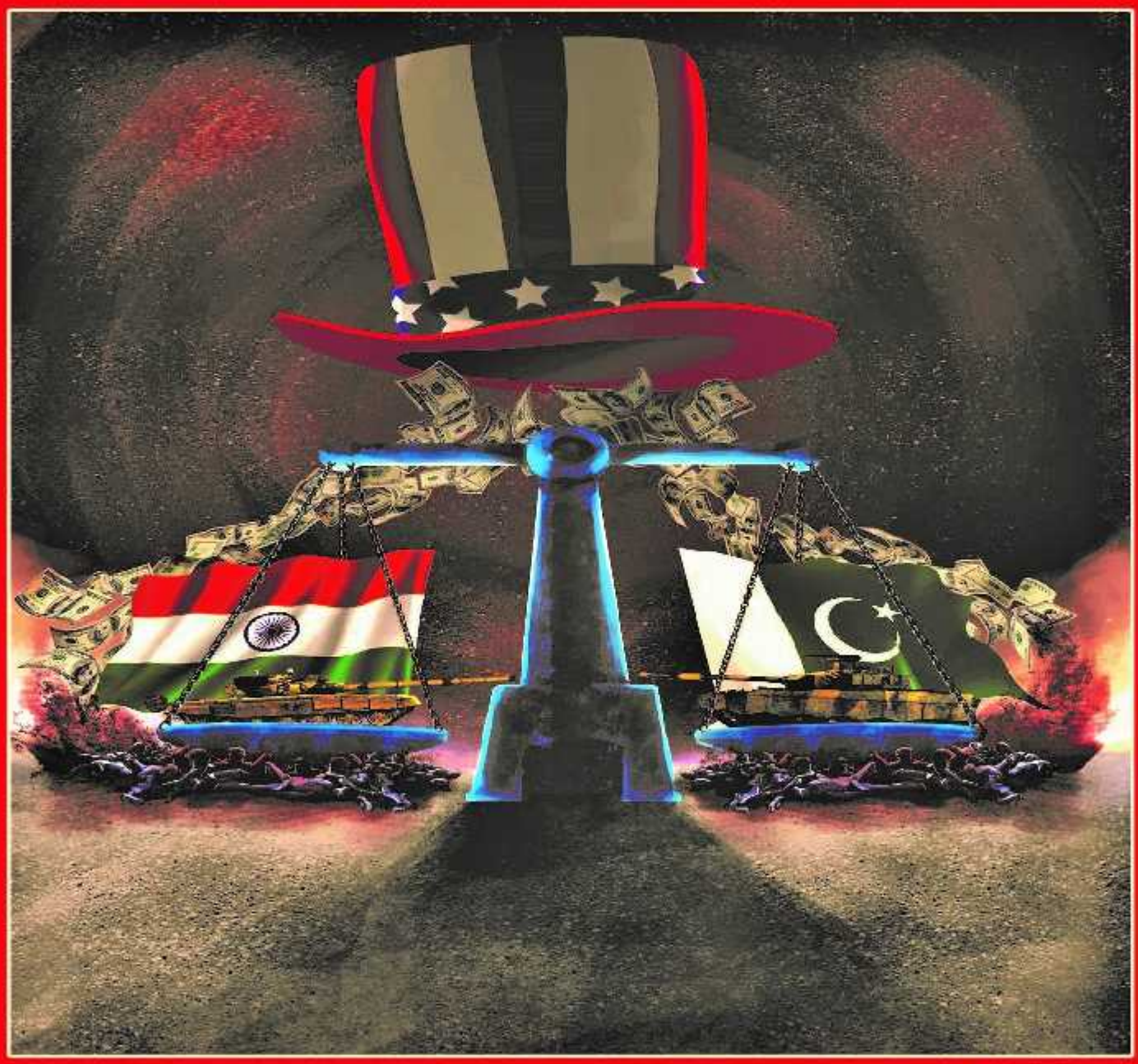

فتح کا جشن ہو یا کہ ہار کا سوگ، زندگی میتوں پہ روتی ہے
جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے، جنگ کیا مسئلوں کا حل دے گی

اے ڈبیلو پی گلگت کے اسیر رہنما بابا جان کی رہائی اور علاج کے لیے کراچی پریس کلب پر مظاہرہ

عوامی ورکرز پارٹی بلوچستان کی جانب سے انٹرنیشنل ورکنگ ڈے پر کوئٹہ میں تقریب کی تصویری جھلکیاں

انٹرنیشنل ورکنگ ویمن ڈے کے موقع پر اے ڈبیلو پی کراچی کے زیر اہتمام تقریب

شمارہ نمبر۔8

جلد نمبر۔15

MONTHLAY
AWAMI JAMHURIAT
LAHORE

ماھنامہ
عوامی جمہوریت
لاھور

CPL No 279

جنوری۔مارچ2019

قیمت:30روپے

ادا ریہ

پاک بھارت جنگی جنون OIC کانفرنس

ہماری داخلہ اور خارجہ پالیسی

پاکستان اور بھارت کے حکمران طبقات یوں تو برصغیر کی تقسیم کے وقت یعنی ۱۹۴۷ء سے ہی ایک دوسرے کے خلاف مذہبی نفرت' جنگی جنون اور سرد گرم جنگ کے طبل بجاتے رہے ہیں لیکن اس سال فروری کے مہینے میں جو فدائی حملہ بھارتی مقبوضہ کشمیر کے شہر پلوامہ میں ہوا جس میں ۲۴ فوجی مارے گئے اور جس کی ذمے داری فوری طور پر جیش محمد نے قبول کرلی اس کے نتیجے میں بھارت نے ۲۶ فروری کو لائن آف کنٹرول عبور کرتے ہوئے پاکستان کے اندر بالاکوٹ کے قریب جابہ کے مقام پر فضائی حملہ اس بنیاد پر کیا کہ اس نے پاکستان کے اندر دہشت گردی کا ایک اڈہ تباہ کر دیا ہے۔اس کے فوری بعد امریکی وزیر خارجہ پوم یو پ ی واور فرانس نے اس حملے کو جائز قرار دے دیا لیکن جواب میں پاکستان نے بھارت کے دو جنگی جہاز مار گرئے اور ایک پائلٹ ونگ کمانڈر ابھی نندن کو گرفتار کرلیا اس طرح دو نیوکلیائی مما لک جنگ کے ایسے دہانے پر پہنچ گئے کہ اس جنگ کی صورت میں دنیا کی نوے فیصد آبادی ختم ہوسکتی ہے جس نے نہ صرف اس خطے بلکہ دنیا بھر میں تشویش کی لہر پیدا کر دی۔

پچھلی دہائی میں پاکستان کے اندر مساجد'مدرسوں' امام بارگاہوں' گرجوں' مندروں' اسکولوں' درس گاہوں' فوجی اڈوں اور بازاروں میں بے شمار فدائی اور خودکش' دہشت گرد حملے ہوئے اور ہزاروں بیگناہ انسان مارے گئے' جائیدادیں تباہ ہوئیں' پاکستان نے ان کی ذمے داری بیرونی قوتوں پر ڈالنے کی کوشش کی لیکن اس پر کوئی یقین کرنے پر تیار نہیں۔اس کی کھلی وجہ یہ ہے کہ پاکستان ریاستی سطح پر انیس سو اسی کی دہائی سے مذہبی انتہا پسندی' دہشت گردی اور بیرونی مما لک خصوصاً افغانستان اور کشمیر میں مداخلت کے ایسے کاروبار میں شریک رہا ہے جس پر اس وقت پاکستان میں احتجاج کرنے والے کو ملک و اسلام دشمن کہا جاتا تھا لیکن اب تو نہ صرف حکمران طبقات کے سیاسی رہنما بلکہ حکومتی اور ریاستی سطح پر بھی تسلیم کیا جا رہا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ ماضی میں پاکستان نے امریکی' سعودی اور دیگر عرب مما لک کی بھرپور مالی اور عملی مدد سے اسلام کے نام پر جہادی تیار کیے جنہیں افغانستان اور بعد میں کشمیر بھیجا گیا...... ملک کے اندر ہزاروں مدرسے قائم ہوئے جو جہادی فیکٹریوں کے طور پر کام کر رہے

سرپرستِ اعلیٰ
عابد حسن منٹو

ایڈیٹر
اختر حسین

مجلس ادارت
مسلم شمیم' صباالدین صبا' توقیر چغتائی
اثر امام' عابد شکیل فاروقی

مینجنگ ایڈیٹر
اے آر عارف

سرکولیشن منیجر
اشتیاق اعظمی

لاہور آفس 5 میکلوڈ روڈ لاہور' پاکستان

ادا ریہ 1
۲۰۱۹ء میں معاشی امکانات...... نجم الحسن عطا 6
امریکی طالبان مذاکرات...... ڈاکٹر ریاض شیخ 9
کمیونزم اور ف ہ ئیزم ...... شاداب مرتضی 11
معاشرے کے ہاتھوں میں غازی صلاح الدین 14
سعودی ولی عہد...... بابر ایاز 15
افغانستان میں سرخ سیاست اثر امام 16
چین اور چینی کمیونسٹ پارٹی صباالدین صبا 18
قومی سوال کا تاریخی تناظر محمد سعید 23
وینزویلا بولی وارین انقلاب صباالدین 27
جلیانوالہ باغ...... پرویز فتح 29
سانحۂ ساہیوال عابد شکیل 33
چہرے نہیں نظام...... محمد جعفر 37
وفاقی ایگزیکٹیو کمیٹی کا سیاسی بیان 38
سیاسی سرگرمیوں پر ایک نظر عابد شکیل فاروقی 39

فون:042-37353309-37357091
فیکس:94-42-36361531
کراچی آفس: 201-204، ء ورلڈ اسینٹر فاطمہ جناح روڈ صدر کراچی
Email:awami.jamhuriat@gmail.com

پبلشر راجہ محمد ولایت نے پیپلز پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر 5 میکلوڈ روڈ لاہور سے شائع کیا۔

کہا جارہا ہے کہ اس کاروبار کو بند کیا جائے ۔ بین الاقوامی دباؤں پر اگر کچھ تنظیموں پر پابندی لگائی جاتی ہے تو وہ سرکاری آشیر باد سے دوسرے ناموں سے وہی کام کرنے لگتے ہیں اس جہادی پالیسی نے ہی جہاں کشمیریوں کے حق خود ارادی کی سیاسی جدوجہد کو اندرونی طور پر تقسیم اور بین الاقوامی طور پر نقصان پہنچایا ہے وہاں پاکستان کے اندر مذہبی انتہا پسندی' فرقہ پرستی' تنگ نظری' عدم برداشت کو پھیلایا اور جمہوری کلچر کو تباہ کیا ہے اور بین الاقوامی طور پر پاکستان مکمل تنہائی کا شکار ہوا ہے ۔ حالیہ دنوں میں چین' روس اور بھارت کے وزرائے خارجہ کے چین میں ہونے والے سہ فریقی اجلاس کے بعد جو بیان جاری ہوا وہ انتہائی اہم'' وہ جو دہشت گرد کاروائیوں کی تیاری کرتے ہیں' اس کے لیے اکساتے ہیں یا پھر دہشت گردی کی حمایت کرتے ہیں' کا احتساب کیا جائے اور انہیں سزا دی جائے ۔''

چینی وزیر خارجہ نے اس موقع پر کہا کہ'' ہم (چین' روس اور بھارت) نے اتفاق کیا ہے کہ مشترکہ طور پر ہر طرح کی دہشت گردی کی بیخ کنی کی جائے اور اس کے لیے پالیسی کے تحت عملی تعاون کیا جائے' خاص کر دہشت گردی اور انتہا پسندی کی زرخیز زمینوں کے خلاف ۔''

چینی وزیر کی زبان میں ہی بھارتی وزیر خارجہ سشما سوراج نے بالا کوٹ حملے کو دہشت گردی کی زرخیز زمین پر حملہ قرار دیا ہے۔

پاکستان میں معاشی و سماجی ترقی اور عوام کے وسیع تر جمہوری معاشی و سماجی حقوق کے مدنظر پالیسیاں وضع کرنے کی بجائے ہمارے حکمران طبقات نے ایک طرف سامراجی کاسہ لیسی کی اور دوسرا مذہبی بنیادوں پر مسلمان ملکوں کے ساتھ تعلقات کا نعرہ لگایا اور آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس OIC کو پاکستان کا کارنامہ سمجھتے تھے مگر OIC کے وزرائے خارجہ کی سطح پر حالیہ اجلاس نے پاکستان کی حیثیت کو متعین کر دیا ہے۔ سعودی عرب کے دفاع اور اسلامی ملکوں کی فوج کی سربراہی اپنے سابقہ آرمی چیف جنرل راحیل شریف کو دے کر وزیراعظم سعودی شہزادے محمد بن سلمان کی ڈرائیوری کر کے اور شہنشاہی بگھی کی سواری کرا کر نازاں ہیں یہ غور کیے بغیر کہ باقی مسلمان ملکوں میں اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے جو اپنے اپنے قومی اور معاشی مفادات کے تحت سوچتے ہیں ۔ پاکستان نے تمام مسلمان ملکوں کے سربراہوں کو خطوط لکھے کہ بھارتی وزیر خارجہ کو جو مبصر کے طور پر بلکہ معزز مہمان کے طور پر دعوت دی گئی ہے اسے منسوخ کیا جائے اور بائیکاٹ کی دھمکیاں بھی دیں کہ ہم بنیادی رکن ہیں لیکن اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ کانفرنس کا بائیکاٹ کر کے پاکستان مزید تنہائی کا شکار ہوا۔ مسئلہ کشمیر کا اعلان نامے کی بجائے قرارداد میں ذکر کر کے سعودی عرب کو گوادر میں جگہ دے کر ہم نے چین اور ایران کو بھی ناراض کر دیا ہے۔

پاکستانی حکمران یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ بین الاقوامی تعلقات میں ممالک کی پالیسیاں معاشی مفادات کے تحت بنتی اور بگڑتی ہیں امریکہ اور مغربی ممالک کے بھارت کے ساتھ معاشی تعلقات کہیں گہرے ہیں ہم سعودی عرب کی طرف سے محض بیس ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کی یادداشتوں پر نعرے لگا رہے ہیں جبکہ سعودی عرب کی بھارت میں اس سے کئی گنا زیادہ سرمایہ کاری ہے بائیس ارب ڈالر کی سرمایہ کاری صرف ایک ریفائنری کی ہے اسی سال بھارت کی سعودی عرب کو برآمد کا حجم 5400 ملین ڈالر سے زائد ہے۔ پاکستان کی ایران کو برآمد کا حجم صرف 400 ملین ڈالر ہے جبکہ بھارت اور ایران کی تجارت کا حجم 13,760 ملین ڈالر ہے ۔ اسی طرح بھارت کے تجارتی و سیاسی تعلقات باقی مسلمان اور خاص کر عرب' امریکی اور ایشیائی ملکوں سے ہیں ۔ اس لیے ہمیں اپنی معیشت کو استوار کرنے کے لیے انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے جو سامراجی اور آئی ایم ایف کے نسخوں پر نہیں ہو سکتیں۔

حالیہ بھارتی جارحانہ پالیسیوں کے مقابلے میں جو پاکستان نے صلح جوئی اور مذاکرات کی پالیسی اختیار کی ہے وہ خوش آئند ہے اور جو 60 سے زیادہ مذہبی و جہادی تنظیموں پر پابندی عائد کی ہے اور کچھ افراد کو گرفتار کیا ہے وہ پہلے کی طرح سطحی اور وقتی مصلحتوں اور محض بین الاقوامی دباؤ کے تحت نہیں ہونا چاہیے بلکہ پاکستان کو داخلی اور خارجی پالیسی کے حوالے سے اپنے پورے بیانیے کو بدلنے کی ضرورت ہے ۔ جس میں پہلے مذہب کی ریاستی کاروبار سے علیحدگی' ملک کے زرعی اور صنعتی یعنی معاشی ڈھانچے میں بنیادی تبدیلیاں اور لوگوں کے معاشی و سماجی مفادات کی ضمانت اور خارجہ تعلقات میں صرف پاکستان کے معاشی مفادات کو مقدم رکھنا ضروری ہے یہی پالیسی پاکستان کے وجود اور ترقی کی بنیاد ہے اور ہمیں بین الاقوامی تنہائی سے نکال سکتی ہے۔

☆.....☆

اداریہ

مارچ خواتین کا عالمی دن

اور سماجی تبدیلی میں خواتین کا کردار

8 مارچ کو خواتین کا عالمی دن منایا جاتا ہے اور یہ بات تو بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ ہے کہ ترقی پذیر ممالک تو درکنار ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک میں بھی خواتین کو مردوں کے مساوی معاشی، سیاسی و سماجی حقوق حاصل نہیں ہیں۔ اگر تاریخی طور پر دیکھیں تو نیوزی لینڈ میں خواتین کو ووٹ کا حق 1893 امریکہ میں 1921 اور برطانیہ میں 1929 اور سویٹزر لینڈ میں 1970 میں ملا اور یہ سیاسی حق بھی محنت کش خواتین کی طویل جدوجہد کا نتیجہ ہے جیسا کہ پہلی دفعہ 14 جولائی 1877 کو امریکہ میں بالٹی مور اور اوہا کی گارمنٹ فیکٹری ورکرز اور مغربی ورجینیا کی خواتین کارکنان نے برابر معاوضے کے لیے عظیم ہڑتال منعقد کی اور اسی ہڑتالے کے نتیجے میں انٹرنیشنل لیڈیز گارمنٹ ورکرز یونین کی بنیاد رکھی گئی اور 28 فروری 1909ء کو پہلا عالمی طور پر خواتین کا دن منایا گیا اور 1910 میں کوپن ہیگن میں بین الاقوامی سوشلسٹ انٹرنیشنل میں 17 سے زیادہ یورپی ممالک سے سیکڑوں خواتین نے شرکت کی اور اس طرح یورپی ممالک میں خواتین کے حقوق کی جدوجہد تیز ہوئی اور دن منایا جانے لگا

1917 میں روسی/سویت سوشلسٹ انقلاب کے بعد دنیا کی پہلی ریاست نے تمام امتیازی قوانین ختم کردیے اور 8 مارچ کو سرکاری سطح پر خواتین کا عالمی دن منایا اور پھر بین الاقوامی طور پر یہ دن منایا جانے لگا۔ امریکہ اور یورپ میں ووٹ کا سیاسی حق ملنے کے علاوہ آج بھی خواتین برابر معاشی و سماجی حقوق سے محروم ہیں اور مسلسل جدوجہد میں برسرپیکار ہیں۔

خواتین کی جدوجہد دراصل پدرسری سماج کے اندر برابر معاشی، سیاسی و سماجی حقوق کے حصول کی ہے اور پدرسری سماج کی بنیاد طبقاتی نظام کے وجود سے ہے کیونکہ مردوں کے معاشرے میں بالادستی ذرائع پیداوار کی ملکیت سے قائم ہوئی اس لیے مارکسسٹوں کے نزدیک خواتین کو اس وقت تک مساوی معاشی، سیاسی و سماجی حقوق حاصل نہیں ہوسکتے جب تک طبقاتی نظام قائم ہے اور طبقاتی نظام کے خلاف جدوجہد دراصل محنت کش مردوں، خواتین اور تمام محنت کار عوام نے مل کر لڑنی ہے لہذا خواتین کو بین الاقوامی طور پر اور اپنے اپنے ملکوں میں سماجی حالات کے مطابق ایک طرف موجود امتیازی قوانین کے خلاف اور ان معاشرتی پابندیوں جن کی وجہ سے وہ اور پیچھے رہ گئی ہیں ان کے خلاف لڑنی ہے اور دوسرا اس شعور کو اجاگر کرنا ہے کہ بنیادی سماجی تبدیلی کے بغیر برابر معاشی، سیاسی اور سماجی حقوق کا حصول ناممکن ہے اور یہ بنیادی سماجی تبدیلی ان مردوں اور سیاسی پارٹی کے ساتھ مل کر ہی لڑنی ہوگی جن کا نظریہ اور منتہائے مقصود سوشلسٹ انقلاب اور غیر طبقاتی سماج کا قیام ہے۔

پاکستان جو جاگیرداری، بڑی زمینداری اور قبائلی باقیات کا ملک ہے اور جہاں سامراجی بالادستی میں سرمایہ داری ترقی کررہی ہے اور مذہبی انتہا پسندی، فرقہ واریت اور عدم برداشت اپنے عروج پر ہے وہاں پدرسری نظام کی بدترین شکلیں موجود ہیں جہاں تعلیمی پسماندگی، صحت، علاج، معالجے کی محرومی، معاشرتی و سماجی پسماندگی، ہر قدم اور ہر سطح پر خواتین سے امتیازی سلوک، جنسی ہراسگی، بچوں کی شادی، برابر کام کا برابر معاوضہ نہ ملنا، گھریلو تشدد، ریاستی سطح پر امتیازی قوانین کی تشکیل اور آئین میں جنسی برابری کا حق تحریر ہونے کے باوجود ووٹ تک کا برابر حق استعمال کرنے کی پابندیاں اس کا ثبوت ہیں کہ خواتین کی برابری کی جدوجہد انتہائی طویل اور کٹھن ہے اس صورتحال کے مدنظر اس سال خواتین کے 8 مارچ کے اجتماعات عورت مارچ کے نام سے قابل ستائش ہیں، جن سے ہزاروں خواتین متحرک ہوئیں۔ یہ اجتماعات اور مظاہرے مختلف صوبوں اور شہروں میں خواتین کی سیاسی و سماجی تنظیموں، NGO`s اور انفرادی سطح پر لبرل خیالات کی نمائندہ خواتین نے دو تین ماہ کی مسلسل کاوشوں سے منعقد کیے، ان کے علاوہ عوامی ورکرز پارٹی نے اپنے پلیٹ فارم سے 8 مارچ یا اس کے بعد خواتین کے برابر حقوق کے لیے مختلف مذاکرے یا کانفرنسیں منعقد کیں۔

عورت مارچ میں اتنے بڑے اجتماعات اور مظاہروں سے ملک کے رجعت پرست اور تنگ نظر مذہبی حلقوں میں کھلبلی مچ گئی اور عورت مارچ میں چند پلے کارڈز کے نعروں کو بنیاد بنا کر زبردست مخالفانہ پروپگنڈہ کیا گیا۔ دراصل ایسے انتہائی محدود دو چار نعرے/ پلے کارڈز جو بعض آزاد خیال خواتین نے اٹھا رکھے تھے ان پر بعض ترقی پسندوں نے بھی تنقید کی لیکن ترقی پسند حلقوں کی طرف سے آزاد خیالی پر نظری اور دوستانہ تنقید تھی اور یہ تنقید اور اختلاف ہمیشہ سوشلسٹ اور آزاد خیال نظریات یا سوشلسٹ فیمنزم اور لبرل فیمنزم کے درمیان رہا ہے دراصل ہماری سوشلسٹ اور ترقی پسند خواتین کی ان لبرل خواتین کے ساتھ سنجیدہ بحث مباحثوں کی ضرورت ہے، گو کہ ان کے نعروں کے پیچھے بھی سماجی دباؤ یا زیادتیوں کی وجوہات ہوں گی لیکن انہیں اپنے ملک کے اندر مذہبی انتہا پسندی، تنگ نظری اور پسماندہ سماجی، تہذیبی و ثقافتی منظرنامے کو بھی مدنظر رکھنا ہے تاکہ ہمارے مخالفین کو یہ موقع نہ مل سکے کہ عام لوگوں کو ہمارے خلاف بھڑکا سکیں دراصل ہمیں اپنے عوام کی وسیع تر تعداد مرد و خواتین دونوں کے ساتھ جوڑنا ہے اور برابر معاشی اور سماجی حقوق کے لیے مل کر لڑنا ہے تاکہ بنیادی سماجی تبدیلی کی راہ ہموار کرسکیں جس کے بغیر نہ پدرسری نظام کا خاتمہ ہوگا اور نہ ہی خواتین کو برابر معاشی، سیاسی و سماجی حقوق مل سکتے ہیں ☆☆

اداریہ

23 مارچ 1931۔ 23 مارچ 1940
اور
جذبۂ حب الوطنی

برصغیر کی تاریخ میں 23 مارچ کا دن انتہائی اہم ہے پہلے 23 مارچ 1931 کی بات کرتے ہیں جس دن اس غیر منقسم ہندوستان کی آزادی کے سب سے بڑے مجاہد اور ہیرو بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں سُکھ دیو اور راج گرو کو لاہور کی کوٹ لکھپت جیل' موجودہ شادمان چوک کی جگہ انگریز سامراجی سرکار نے پھانسیاں دی تھیں۔ شہید بھگت سنگھ ضلع لائل پور' موجودہ فیصل آباد کی تحصیل جڑانوالہ کے گاؤں بنگے میں 28 ستمبر 1907ء کو پیدا ہوئے ان کے والد کشن سنگھ اور دادا ارجن سنگھ بھی آزادی کی سیاسی تاریخ کے حصہ تھے۔

ان کی زندگی میں انقلاب بارہ سال کی عمر میں آیا جب انہوں نے 1919 میں جلیانوالہ باغ کا خونی واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا جہاں بریگیڈیر جنرل ڈائر نے عوامی جلسے پر براہ راست فائرنگ کرائی، سیکڑوں لوگ شہید ہوئے اور یہ واقعہ سامراجی سیاہ تاریخ کا بہت بڑا اور اہم باب بن گیا اس کے بعد ہی شہید بھگت سنگھ کے خیالات اور نظریات میں انقلابی تبدیلیاں آئیں اور انہوں نے فیصلہ کرلیا کہ انگریز کی غلامی کے خلاف مسلح جدوجہد ضروری ہے اور انہوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن پارٹی قائم کی، انہوں نے 1928 میں جب سائمن کمیشن آیا اور اس کے خلاف احتجاج میں بہت بڑے ترقی پسند ٹریڈ یونین لیڈر لالہ لجپت رائے جن کی والدہ کے نام سے لاہور میں گلاب دیوی ہسپتال قائم ہے انہیں لاٹھی چارج میں زخمی کر کے شہید کر دیا تو شہید بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں نے بدلہ لینے کا فیصلہ کیا۔ کیپٹن اسکاٹ مارا گیا اور پھر انہوں نے دہلی اسمبلی میں آزادی کی تحریک کو ابھارنے کے لیے دھویں کا بم پھینکا جس پر انہیں گرفتار کرکے 23 مارچ 1931 کو پھانسیاں دی گئیں۔ شہید بھگت سنگھ اور ان کے ساتھی انگریز سے آزادی کے ساتھ اس کے سرمایہ دارانہ نظام اور انگریزوں کے کاسہ لیسوں سے بھی گلوخلاصی چاہتے تھے تاکہ محنت کش عوام کو حقیقی آزادی حاصل ہوسکے۔

دوسرا 23 مارچ 1940 جب آل انڈیا مسلم لیگ نے لاہور قرارداد میں کھل کر ہندوستان کے پہلے 1935 کے آئین کے تحت قائم وفاقی اکائیوں کے اختیارات کو چیلنج کیا اور مسلمانوں کی عددی اکثریت والے علاقوں کی بنیاد پر خودمختار یونٹس بنانے کا مطالبہ کیا کیونکہ مسلم لیگ کی نظر میں تمام تر معاشی اختیارات اکائیوں کے پاس ہونے چاہئیں دراصل مسلم لیگ کا مطالبہ تھا کہ وفاق کے پاس صرف دفاع، امور خارجہ اور بین الصوبائی مواصلات ہی کے محکمے ہونے چاہئیں باقی تمام اختیارات صوبوں/ وفاقی اکائیوں کے پاس ہوں تاکہ مسلمان جلد ترقی کرسکیں اسی کی بنیاد پر انہوں نے 1946 میں کیبنٹ مشن پلان کو منظور کرلیا تھا مگر کانگریس کے انکار پر ایک سال کے اندر ہندوستان کی تقسیم کا فیصلہ ہوگیا۔ آزادی کا قانون پاس ہونے کے بعد 11 اگست 1947 کو قائداعظم نے آئین ساز اسمبلی کا صدر منتخب ہونے پر آئین کی بنیادیں ان اصولوں پر رکھنی چاہئیں کہ پاکستانی ریاست کے تمام شہری مذہب، رنگ، نسل کی تفریق کے بغیر برابر کے شہری ہوں گے اور ریاست کا مذہب سے کوئی تعلق نہ ہوگا پھر 1948 میں ریاست قلات کے ساتھ معاہدہ کرکے یہ تسلیم کیا گیا کہ وفاق کے پاس صرف دفاع، امور خارجہ اور بین الصوبائی مواصلات ہی کے محکمے ہوں گے باقی تمام معاملات میں ریاست خودمختار ہوگی۔ آئینی تشکیل کے لیے آئندہ کے وفاق کی بنیادیں رکھ دی تھیں۔ مگر وفاقی اور وفاقی اکائیوں کے ساتھ اس کے بعد کیا ہوا، اور کس طرح قائداعظم کے سیکولر اصولوں کے خلاف ایک مذہب کی بالادستی قائم کی گئی اس کا ذکر یہاں کرنے کی ضرورت نہیں ہے یہ کافی ہے کہ قائد کا پاکستان ٹوٹ گیا موجودہ وفاقی اکائیاں ابھی بھی مسلسل اپنے وسائل پر اختیار کی جدوجہد کررہی ہیں ملک میں مذہبی منافرت، فرقہ پرستی، انتہاپسندی، عدم برداشت اور دہشت گردی کی انتہا پر ہے اور محنت کش عوام نان شبینہ کو ترس رہے ہیں۔

ہم 23 مارچ کو یوم پاکستان کا جشن مناتے ہیں مگر ایک دوسرے کو صحیح مسلمان اور محبِّ وطن ماننے کو تیار نہیں بلکہ ملک دشمنی اور غداری کے طعنے دیتے ہیں پھر یہ حب الوطنی کیسے قائم ہوگی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم اپنے تعلیمی نظام میں آزادی کی تاریخ پڑھانے کے بجائے ہندو مسلم مخالفت، فسادات، تقسیم اور ہجرت ہی پڑھاتے ہیں ہم نے اپنے تعلیمی نصاب میں ان ہیروز اور مجاہدوں کو شامل ہی نہیں کیا جنہوں نے وطن کی آزادی کے لیے جدوجہد کی اور اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا جن میں اس دھرتی کا سپوت بھگت سنگھ صف اوّل میں ہے مگر اس کی کوئی یادگار بھی لاہور میں قائم کرنے پر تیار نہیں اسی طرح پنجاب، سندھ، بلوچستان اور خیبر پختونخواہ کے ہیروز ہیں ہمارے نوجوانوں کو انگریز سے آزادی کی تاریخ کا کوئی علم نہیں جس سے ان کو اس وطن سے محبت پیدا ہو۔ تاریخ پڑھاتے ہیں تو ان ٹوڈی لیڈروں کی جو انگریزوں کے کاسہ لیس تھے اور بعد میں جاگیری باقیات قائم کرنے کے ذمے دار ہیں دوسرا اس ملک میں موجود وفاقی اکائیاں ان اختیارات کے ساتھ وفاق کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔ عوام کی یہ حالت ہے کہ تعلیم' صحت علاج معالجے' روزگار اور چھت سے محروم ہیں انہیں زندگی کے بنیادی حقوق کی نہ آئین ضمانت دیتا ہے نہ ریاست اور حکمرانوں کی کمٹمنٹ ہے۔

حب الوطنی محض نعرے بازی اور اسلام کا نام لینے سے پیدا نہیں ہوگی۔ اسلام کا تعلق تو ایک ملک سے نہیں ہے یہ تو بین الاقوامی ہے پاکستان سے محبت تو اس کی تاریخ اور آئندہ کے مفادات سے جڑے رہنے سے ہوگی اس کے لیے ہمیں اپنے ریاستی بیانیے کو بدلنے اور بنیادی معاشی، سماجی وسیاسی نظام میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔

اداریہ

کرائسٹ چرچ نیوزی لینڈ

دہشت گردی اور سیکولرازم کی اہمیت

گزشتہ دنوں کرائسٹ چرچ نیوزی لینڈ کے شہر کی دو مساجد میں کسی نسل پرست جنونی نے براہ راست فائرنگ کی جس میں پچاس سے زیادہ معصوم انسانی جانوں کا زیاں ہوگیا لیکن یورپ میں جنونیت اور دہشت گردی کے اس بدترین واقعہ کے فوراً بعد جس طرح سے نیوزی لینڈ کی وزیراعظم جیسنڈا آرڈرن نے ردعمل کا اظہار کیا اس کی تعریف وتحسین سے دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ بھرے پڑے ہیں ۔وزیراعظم فوری طور پر سیاہ لباس میں دوپٹہ اوڑھ کر مساجد گئیں ہاتھ جوڑ کر لوگوں سے معافی مانگی۔ پارلیمنٹ میں السلام علیکم کہہ کر تقریر شروع کی۔ پورے ملک میں اذانیں دلوائیں پورے عوام کو مسلمانوں کے ساتھ یکجہتی میں سوگوار کھڑا کر دیا اور پورے ملک میں ہتھیار رکھنے پر قانونی پابندی لگادی حالانکہ نیوزی لینڈ کی کل آبادی کا مسلمان صرف ایک فیصد ہیں یہ اقدامات ریاست اور سیاسی قیادت کی اس کمٹمنٹ کا اظہار کرتے ہیں کہ ریاست کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے اور تمام شہری بغیر کسی مذہب عقیدے جنس یا رنگ ونسل کے امتیاز کے بغیر برابر ہیں اور تمام دکھ سکھ سانجھے ہیں۔

پاکستانی وزیراعظم، دیگر سیاست دانوں اور علماء سمیت تمام نے نیوزی لینڈ کی وزیراعظم اور عوام کی تعریف کی لیکن کیا ہمارے یہ رہنما اپنے ملک میں ایسا معاشرہ قائم کرنے کے لیے تیار ہیں جس کی وہ نیوزی لینڈ میں دہشت گردی کے خلاف ریاستی وسیاسی ردعمل کی تحسین وتوصیف کر رہے ہیں ہمارے ملک میں مساجد وامام بارگاہوں سمیت کتنے چرچ اور مندر جلائے گئے کتنی عیسائی اور ہندو بستیاں جلائی گئیں آئے دن کتنی ہندو اور غیر مسلم عورتوں کو اغوا اور ریپ کیا جاتا ہے اور زبردستی کی شادی یا مسلمان بنایا جاتا ہے کبھی ریاست نے یا کسی سیاست دان بڑی سیاسی پارٹی (سوائے بائیں بازو وسیکولر افراد کے، جن کی آواز سنائی نہیں دیتی) یا علماء یا میڈیا نے اس طرح کے ردعمل کا اظہار کیا ہے جو نیوزی لینڈ کی وزیر اعظم اور عوام نے کیا ہے ایسا کیوں ہے کیا 72 سال بعد بھی ہم غور کرنے کے لیے تیار ہیں یہ لمحہ فکریہ ہے۔

ہمارے حکمران اور علماء ان ملکوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، وہاں سیکولرازم چاہتے ہیں یعنی وہاں ریاستی اصول و پالیسی بغیر مذہب، جنس، علاقائی تفریق کی ہو اور اپنے ملک میں ہم مذہبی وفرقہ پرستی اور انتہا پسندی پھیلائیں اور اقلیتیوں کو آئینی، قانونی اور عملی طور پر سیاسی وسماجی برابری کا حق نہ دیں اور دوسرے درجے کے شہریوں کا سلوک کریں۔ ستّر سال سے ہم اکثریتی مذہب کی بالادستی اور فرقہ پرستی کی پالیسی پر گامزن ہیں انہی پالیسیوں کی وجہ سے ملک مذہبی انتہا پسندی اور بدترین دہشت گردی کا شکار ہے اور آج ہم بین الاقوامی سیاسی تنہائی اور گرے لسٹ میں شمار ہیں اور بلیک لسٹ سے بچنے کی کوشش کر رہے ہیں معاشی، سیاسی وسماجی پسماندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں جا چکے ہیں پاکستان اور دیگر مسلمان ملکوں کے اندر مذہبی انتہا پسندی اور دہشت گردی کو پروان چڑھانے کے نتیجے میں امریکہ اور بعض یورپی ممالک میں اسلاموفوبیا ہوا ہے اس تاریکی کے دور میں بھی ہم امید کرتے ہیں کہ ستر سال کی مذہبی وفرقہ وارانہ پالیسیوں کو آئینی و قانونی طور پر بدلنے کے ساتھ ریاستی پالیسی کی بنیادیں سیکولر/ دنیاویت پسندی کے نظریے پر رکھی جائیں گی یعنی یہ کہ ریاست کی نظر میں تمام شہری مذہبی، سیاسی، سماجی طور پر برابر ہیں تاکہ اپنے عوام اور دنیا کی نظر میں ہم ایک مہذب قوم کہلا سکیں لیکن اس کے لیے مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہے۔

عوامی جمہوریت کے قارئین سے درخواست

ہر بار کی طرح اپنے قارئین سے ایک بار پھر سے درخواست ہے کہ:

اپنے اپنے اضلاع، شہر، صوبے میں جاری پارٹی کی سرگرمیوں سے عوامی جمہوریت کو مطلع کریں تاکہ ہم اس پرچے کے ذریعے ملک بھر کے دیگر سیاسی کارکنوں اور تمام دنیا میں رہائش پزیر پاکستانیوں کو ان سرگرمیوں سے آگاہ کر سکیں۔

آپ پارٹی کی سرگرمیوں کے حوالے سے تصاویر بھی اس پرچے میں اشاعت کے لئے بھیج سکتے ہیں۔

پرچے کے مالی اخراجات کو پورا کرنے کے لئے ہمیں آپ کے تعاون کی سخت ضرورت ہے، آپ سے درخواست ہے کہ براہ مہربانی اس سلسلے میں پرچے کے واجبات وقت پر ادا کریں۔ عوامی جمہوریت کو ملکی سیاست ومعیشت، سماجیات، شہری علاقائی پیشہ وارانہ مسائل اور عالمی سیاسی موضوعات پر آپ کی تحریروں کا انتظار رہے گا۔

۲۰۱۹ء میں معاشی امکانات وخدشات

معاشی سدھار کے لیے انقلابی فیصلے کرنا ہوں گے

نجم الحسن عطا

ملکی معیشت گراوٹ کا شکار' روپیہ اپنی قدر کھو چکا' سود کے نرخ بلند اور ملک میں افراط زر کی شرح میں اضافے کا رجحان' ایسا کیوں ہوا؟ اور ۲۰۱۹ء میں معاشی امکانات کیا ہیں؟ یہ سوالات تحریک انصاف کے وزیر مملکت برائے محصولات حماد اظہر نے روزنامہ ''جنگ'' میں شائع ہونے والے اپنے مضمون میں اٹھائے اور ان کے جواب بھی دیے ان کا یہ کہنا درست ہے کہ گزشتہ حکومت نے جی ڈی پی کی شرح سے اشیائے صرف کی شرح زیادہ بلند اور بیرونی سرمایہ کاری پڑوسی ممالک سے کم رہی حکومت بچت سرمایہ کاری اور صنعت کاری کی ترغیب دینے کے بجائے نجی سرمایہ کاری کے مسائل میں اضافہ کرتی رہی نیز حکومت معاشی نمود کھانے کے لیے ان وسائل کو بھی جھونکتی رہی جو ہم رکھتے ہی نہیں تھے مثلاً ۱۳ ارب روپے کے نوٹ چھاپ کر اور عوامی قرضوں کو زر میں ڈھال کر اپنے امور چلائے گئے۔ حماد اظہر کے اس تجزیے سے معاشی خدوخال کی سمجھ بوجھ رکھنے والا کوئی شخص بھی اختلاف نہیں کرسکتا لیکن وزیر موصوف نے آج کی معاشی صورت حال کی خرابی کا سبب نہیں بتایا صرف ماضی کی پالیسیوں پر بات کی۔ اب تحریک انصاف بھی سابقہ مسائل کو حل کیے بغیر اپنی مالیاتی حکمت عملی کو آگے بڑھانے کی کوشش کررہی ہے کیونکہ موجودہ جمہوریت اور اس کے چلانے والے کوئی انقلابی راہ اپنانے سے قاصر ہیں وجہ یہ ہے کہ پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد فلاحی ریاست کا راستہ اختیار نہیں کیا گیا امریکی سامراج کے تشکیل دیے گئے مالیاتی اداروں کے نسخوں اور قرضوں پر ملکی معیشت کی کھوکھلی بنیاد رکھ دی گئی جس کا خمیازہ آج پاکستانی عوام بھگت رہے ہیں پھر یہ کہ پاکستان کی غیر فطری معیشت شروع دن سے ہی کرپشن کا شکار رہی اور جب کسی نے کرپشن پر مضبوط ہاتھ ڈالا تو ساری معیشت کساد بازاری کا شکار ہوگئی۔

پاکستان میں سابق سوویت یونین اور امریکے کے مابین سرد جنگ کے دوران جنم لیا وہ قرضوں پر کھڑی منصوعی معیشت میں کچھ ایسا مشغول ہوا کہ دولت اور طاقت کی تشکیل سرمائے کی بے راہروی کا شکار ہوگئی۔ قومی سرمائے کی تشکیل کے بجائے قرضوں سے ملکی امور چلانے پر اکتفا کیا پاکستان نے سرمائے کی بنیاد سائنس اور ٹیکنالوجی کے اثاثوں پر رکھنے کے بجائے ریڈی میڈ درآمدی سرمائے پر رکھی جس کے باعث معیشت کی لاگت پیداوار اور عالمی مسابقت کے قابل نہ رہی' اس لیے معاشی ملیریا کی سردی کو آئی ایم ایف کے نسخے کے مطابق آگ تاپنے سے دور کرنے کی جاہلانہ کوشش کی گئی اور یوں غلط علاج سے مزید معاشی بیماریاں لاحق ہوتی رہیں ایک وقت ایسا تھا کہ جب پاکستان اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لیے حکمت عملی تیار کرسکتا تھا لیکن سامراجی بیساکھیاں ملکی اشرافیہ اور حکمرانوں کو راس آنے لگیں ۱۹۵۱ء میں کوریا کی جنگ کے دوران پاکستان کی ایکسپورٹ کو عروج ملا لیکن بعد میں آنے والی حکومتوں نے برآمدی صنعتوں کے فروغ کی کوشش ہی نہیں کی۔ اس دور کی حکومتوں کو چاہیے تھا کہ وہ زرعی اور صنعتی پیداوار سے قومی سرمائے کی تشکیل کرتیں تاہم یہ کام کاسترو' چواین لائی اور مہاتیر محمد جیسے لیڈر ہی کرسکتے تھے لیکن بدقسمتی سے قائداعظم کے بعد پاکستان کو ایسی لیڈرشپ میسر نہ آئی جو ملکی معیشت کو اپنے قدموں پر کھڑا کرنے کی ابتدا کرتی۔ سادگی اپنا کر درآمدات کم اور برآمدات زیادہ بڑھائی جاتیں جس طرح بھارت' ملائشیا' سنگاپور اور تیسری دنیا کے دیگر ترقی پذیر ممالک نے کیا اس کے برعکس پاکستان غیر ملکی امداد پر انحصار کرنے لگا امریکی امداد اور اس کی شرائط نے پاکستان کو قدموں پر کھڑا نہیں ہونے دیا۔ اس بات کا اندازہ اس سے کیجیے کہ امریکہ نے ۱۹۶۷ء میں خارجہ تعلقات کا قانون تشکیل دیا تھا جس کی دفعہ ۲۰۱ میں کہا گیا کہ کسی بھی ملک میں ایسی پیداواری صنعت کی تعمیر یا کارکردگی کے لیے امداد نہیں دی جائے گی جہاں ایسی صنعت امریکی صنعت سے مقابلہ کرتی

ہو‘‘ تاہم اس وقت کے پاکستانی حکمرانوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ امریکا کبھی بھی ایسی امداد نہیں دے گا جس سے کوئی ملک اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔ پاکستان میں فولاد کی صنعت امریکی حکومت نے ۲۵ سال تک بننے نہیں دی آخر کار ۱۹۷۱ء میں سابق سوویت یونین نے پاکستان کی اسٹیل ملز کی تعمیر میں مدد دی۔ اس کے بعد ذوالفقار علی بھٹو نے تیل اور تیسری دنیا کے خام مال کی بات کی۔ تیل کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کی بات کی تو انہیں پھانسی پر چڑھا دیا گیا فرانس کے نامور فلاسفر ژاں پال سارتر نے جنہوں نے الجزائر کی آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ایک مرتبہ کہا تھا ’’ہم پہلی دنیا کے لوگ انسانی حقوق کی بڑی بات کرتے ہیں لیکن تیسری دنیا میں کوئی انسان پیدا ہوتا ہے تو اسے قتل کروا دیتے ہیں۔‘‘

حماد اظہر نئے پاکستان کی بات کرتے ہیں لیکن ان کی پارٹی وہ نہیں جو انقلابی جذبات سے لیس ہو نیز ان کے نوجوان کارکنان کو علم نہیں کہ نیا پاکستان کن خطوط پر استوار کیا جا سکا ہے اسی لیے وہ یہ بھی نہیں سمجھ سکتے کہ پاکستان میں جدید سامراجی اثر کے تحت اور بیرونی امداد کے ذریعے جو ترقی ہوئی ہے اس پر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے ملک کی اقتصادی منصوبہ بندی میں صنعتی ترقی کو کبھی خاطر خواہ اہمیت نہیں دی گئی پھر جو صنعت کاری ہوئی بھی وہ پیداواری قوتوں کو آگے بڑھانے کے بجائے الٹا سامراج کی بین الاقوامی معیشت میں ہمیں زیر دست رکھتی ہے جو کشکول توڑنے نہیں دیتی اسی لیے وزیر اعظم عمران خان زرمبادلہ کے حصول کے لیے سعودی عرب‘ یو اے ای اور چین کے دورے کر رہے ہیں اور اس میں عمران خان کا کوئی قصور بھی نہیں۔ آصف علی زرداری جو اب کشکول کا مذاق اڑا رہے ہیں ان کی معاشی پالیسیاں سب کے سامنے ہیں دراصل مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی کے وزرائے خزانہ خاص طور پر شوکت عزیز‘ اسحاق ڈار (جنہوں نے پیپلز پارٹی کا پہلا بجٹ بھی بنایا تھا) اور وزارت خزانہ سے منسلک بیوروکریسی یہ سب ہی عالمی مالیاتی اداروں کے سدھائے ہوئے ہیں ان سب کے مفادات عالمی مالیاتی اداروں سے وابستہ ہیں اور انہوں نے پاکستان کو معاشی طور پر اپاہج بنانے میں پورا پورا کردار ادا کیا ہے حماد اظہر کی یہ بات بہت حد تک درست ہے کہ ملک میں اسراف بہت زیادہ رہا ہے با الفاظ دیگر کنزیومرازم نے ملک کو ایسا راستہ دکھایا جہاں کرتا دھرتا افراد نے ملک کی آمدنی کم کر دی اور اخراجات بڑھا دیے جس کی وجہ سے غریب کے ہاتھ میں سوائے بیروزگاری کے کچھ نہ آیا اس لیے بھی کہ پاکستان کی افرادی قوت کو ہنر مند نہیں بنایا گیا اور حکمرانوں نے زیادہ سے زیادہ قرضوں کے حصول اور کرپشن کے علاوہ کچھ نہیں کیا حالانکہ انہیں علم ہے کہ بین الاقوامی مقابلے میں ترقی کی ضمانت صرف برآمدات کا منافع ہوتا ہے۔ اس منافع پر قائم معیشت ہی حقیقی معیشت ہوتی ہے پھر اس منافع کو دوبارہ سرمایہ کاری میں استعمال کر کے ترقی کا راستہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ یہ راستہ اب بھی اختیار کیا جا سکتا ہے اگر ملک کسی طرح قرضوں کے چنگل سے باہر نکل جائے جس کی ادائیگی کے لیے ۲۰۱۹ء کے آخر تک ۳۰ ارب ڈالرز کی ضرورت ہے۔ علاوہ ازیں حکومت کو زرعی انڈسٹری کے ذریعے ملکی پیداوار بڑھانے پر توجہ دینی چاہیے یقیناً زراعت‘ لائیو اسٹاک‘ فوڈ انڈسٹری‘ اور ویلو ایڈڈ برآمدات کے ذریعے معیشت کو مضبوط بنیادیں فراہم کی جا سکتی ہیں۔ ماضی کی حکومتوں نے یہ مشکل کام نہیں کیا جس کی وجہ سے ملک ۱۰۰ ارب ڈالر کے قرضوں میں پھنسا چالیس ارب ڈالرز کا تجارتی خسارہ ہے گو کہ کرنٹ اکاؤنٹ خسارہ اب کچھ کم ہوا ہے لیکن معاشی حالات دگرگوں ہیں گردشی قرضے ہمیشہ کی طرح زیادہ ہیں تو تمام بڑے ادارے تباہ ہو گئے ہیں۔

ایک طرف کراچی سے ہنزہ تک رنگ برنگی نئے ماڈل کی گاڑیاں فراٹے بھرتی نظر آتی ہیں وہیں ان کے شور میں ۷۰ فیصد نہایت غریب افراد کی آواز دب کر رہ گئی ہے کوئی بڑا ریستوران خالی نہیں ملتا۔ لوگ کھانے کے لیے کھڑے رہتے ہیں تاکہ باری آئے تو کھائیں اور باہر سڑکوں پر مال داروں نے غریبوں کے لیے دستر خوان لگوا دیے ہیں تاکہ ان کے پیٹ میں بھی کچھ جاتا رہے اور وہ بغاوت کے قابل نہ رہیں سو اب کون انقلاب کی بات کرے؟

حماد اظہر پاکستان اب روایتی اقدامات سے ترقی نہیں کر سکتا آپ نے اپنے مضمون میں لکھا ہے سود کی شرح کم تھی تو نئے بزنس اور صنعتی سرگرمیوں کو

فروغ ملنا چاہیے تھا' حالانکہ آپ کو علم ہوگا گزشتہ دو عشروں میں بیرونی قرضے تو لیے جاتے رہے لیکن گزشتہ پانچ برسوں میں ملکی بینکس نے ٹی بلز کے بدلے اس قدر قرضے لیے گئے کہ بینکس کا منافع ۲۰۱۶ء میں ۳۰۰ ارب روپے تک پہنچ گیا۔ ان حکومتی قرضوں کی وجہ سے نجی شعبے کو کچھ نہ ملا ادھر کرپشن نے اس قدر بگاڑ پیدا کر دیا کہ کوئی نہیں بتا سکتا ۲۰۱۹ء میں معاشی اشاریئے روشن ہیں یا ماضی کی طرح تاریک ہی رہیں گے حکومتی خزنہ خالی ہے لیکن سڑکوں' ریستورانوں' بڑے مالز اور ہوائی جہازوں میں رش ظاہر کرتا ہے کہ متوازی معیشت ترقی کر رہی ہے اور امیر بہت زیادہ مالدار ہو رہے ہیں اور غریب کے پاؤں کی چادر رومال بن گئی ہے ان حالات میں تو امید کی بجائے خدشات ہی جنم لے رہے ہیں۔ درحقیقت پاکستان کا غیر صنعتی سماج کنزیومر ازم دو نمبری اور ٹیکس چوری میں جتنا تیز ہے اتنی ہی تیزی سے اس کے قومی وسائل غیروں کے پاس گروی رکھے جا رہے ہیں بڑھی ہوئی آبادی اور گھٹتے ہوئے وسائل کے باعث ایسی کشمکش جنم لے رہی ہے کہ جو ہر قسم کے کنٹرول سے باہر ہوتی جا رہی ہے۔ سماج میں ایک بگاڑ سے دوسرا بگاڑ جنم لے رہا ہے۔ تعلیمی بے مقصدیت علمی بے قدری میرٹ کی تباہی اور وسائل کا زیاں سامنے کی باتیں ہیں۔ ۳۵ لاکھ افراد انکم ٹیکس چوری کر رہے ہیں تو تجارت اور بجٹ کے خسارے مسلسل بڑھ رہے ہیں پھر ملک کو بڑھتے ہوئے انتظامی اخراجات اور کم ہوتے ترقیاتی فنڈز کا سامنا ہے۔ سیاسی موقع پرستی ووٹ بینک کی سیاست اور احتساب کا تماشا جاری ہے کہ کرپٹ لوگوں کے لیے جیل بھی فائیو اسٹار ہوٹل بن گئے فرقہ پرستی' نسل پرستی' علاقہ پرستی مفاد پرست طبقے کی مراعات پر لوٹ مار بھی تھمنے کا نام نہیں لیتی کرپشن کے بارے میں عالمی بینک کا یہ انکشاف کس قدر شرمناک ہے کہ ہر سال دس ارب ڈالر پاکستان سے باہر چلے جاتے ہیں پھر ایک طرف مارکیٹ اکانومی کی آمریت کا دوسرا نام کنزیومر ازم قرضے' کریڈٹ کارڈ' لیزنگ پہ گاڑیاں' استعمال شدہ گاڑیوں کی درآمد' برانڈز کی خریداری کی ہوس ہے تو دوسری جانب مردوں کی تدفین بھی انتہائی مہنگی ہو چکی ہے اگر غریب مر جائے تو اسے ایدھی کے حوالے کر دیا جاتا ہے اس وقت قرضے پیدا کرنے والی میکانیت توڑنے کی ضرورت ہے۔

غیر ملکی سرمایہ درآمد کرنے سے قرض بڑھتے ہیں دور نہیں ہوتے اس لیے تنہا عمران خان کی دیانت کو سامنے رکھتے ہوئے کسی چھکے کے انتظار کے بجائے زرعی اصلاحات پر زور دیا جائے تعیّشات کی درآمد پر پابندی ہونی چاہیے ۔گاڑیاں اسمبل کرنے کے بجائے اپنے ملک میں بنائی جائیں لائیو اسٹاک ڈیری فارمنگ اور چھوٹے کاشتکاروں کے ذریعے زرعی انقلاب لایا جائے ورنہ قرضوں کی معیشت خدشات اور تباہی ہی لائے گی کہ روشن امکانات تو زرعی اصلاحات میں ہی ہیں۔ وفاقی وزیر منصوبہ بندی و ترقی خسرو بختیار نے گزشتہ دنوں ایک بیان میں کہا کہ حکومت پانچ سالہ منصوبہ تشکیل دے رہی ہے جس کا مقصد 5.8 فیصد شرح نمو کا حصول ہے علاوہ ازیں اگلے پانچ برسوں میں زراعت کی گروتھ 3.6 صد ہوگی اور صنعتوں کو ترقی دے کر 6.8 تک لے جایا جائے گا۔'' یہ بظاہر بڑی خوبصورت باتیں ہیں تاہم لگتا ہے کہ وزیر موصوف نے رجائیت سے کام لے رہے ہیں کیونکہ اس وقت تو ملکی معاشی حالت ابتری کا شکار ہے اور کوئی شعبہ منافع نہیں دے رہا سوائے سیمنٹ سازی یا شکر سازی کے۔ ایکسپورٹ روپے کی قدر میں تیس فیصد کمی کے باوجود دس فیصد بھی نہیں بڑھی تو پھر کیسے مجوزہ پانچ سالہ منصوبے کے طے کردہ اہداف حاصل کیے جاسکیں گے؟ نیز یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ غربت میں تخفیف کی جائے اور روزگار میں اضافہ کیا جائے گا مگر ابھی تک اس جانب کوئی سنجیدہ قدم نہیں اٹھایا گیا ہے یاد رہے سابقہ حکومت نے بھی پانچ سالہ منصوبے کے جو خدوخال پیش کیے تھے زمینی حقائق اس کے برخلاف ہی رہے جب پوچھا گیا کہ موجودہ حکومت اس پانچ سالہ منصوبے کو کس طرح پورا کرے گی تو خسرو بختیار نے کچھ بتانے سے انکار کر دیا دراصل یہ اہداف حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ معیشت کے ڈھانچے میں بنیادی تبدیلیاں لائی جائیں غربت اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے اور دوسری طرف ٹیکس چوری اسمگلنگ وغیرہ عام ہے تو ان برائیوں کا تدارک کیے بغیر حکومت اپنے اہداف حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔ اس سلسلے میں صرف صوبہ سندھ ہدف کے مطابق ریونیو اکٹھا کر پایا ہے لیکن اسے ابھی تک این ایف سی ایوارڈ کے ۲۸ ارب روپے نہیں دیے گئے اور نئے ایوارڈ پر بھی بات چیت نہیں ہوئی ☆

امریکہ۔طالبان مذاکرت

امریکی افواج کا انخلاء، اثرات، کشمکش

ڈاکٹر ریاض شیخ

فروری ۱۹۸۹ء میں افغانستان سے سوویت یونین کی افواج کی واپسی کے چار دہائیوں کے بعد اس وقت امریکی افواج کی واپسی کا عمل زیر بحث ہے۔ امریکی صدر ٹرمپ کی طرف سے امریکی افواج کی واپسی کے عمل کے اعلان کے ساتھ ہی جہاں صورتحال نے ڈرامائی صورت اختیار کر لی ہے وہیں اس کے ساتھ ہی کئی پیچیدہ مسائل نے ایک بار پھر سر اٹھالیا ہے۔اس مرحلے پر کئی اہم سوالات نے جنم لیا ہے مثلاً امریکہ کو سترہ برس کے بعد ایک دم اچانک واپسی کی کیا جلدی ہوگئی؟ امریکی افواج کی واپسی کی صورت میں افغانستان کی اندرونی صورت حال کیا شکل اختیار کرے گی؟ علاقے پر اس کے کیا اثرات پڑیں گے؟ علاقائی ممالک کی نئی صورت حال میں مفادات کیا ہوں گے؟ اور سب سے زیادہ اہم سوال یہ کہ اس ساری صورت حال میں پاکستان کی کیا دلچسپی ہے؟ پاکستان امریکی افواج کی افغانستان سے واپسی میں کیا کردار ادا کرے گا اور بعد ازاں افغانستان میں پاکستان کی کیا دلچسپی ہوگی؟ ان سوالات کے علاوہ دیگر کئی اہم سوالات ہیں جن کے جوابات درکار ہوں گے۔

گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ کے واقعات کو جواز بنا کر امریکہ افغانستان پر حملہ آور ہوا اور گزشتہ سترہ برس کے دوران اس کے ہزاروں فوجی اور اربوں ڈالرز کا نقصان ہوا لیکن اس تمام تر نقصانات کے باوجود امریکہ اس خطے میں اپنی موجودگی برقرار رکھنا چاہتا ہے۔افغانستان میں اپنی افواج کے ذریعے وہ چین روس اور ایران کا پڑوسی بن کر ان کے حالات پر کڑی نظر رکھنے کے قابل تھا لیکن یہ عمل انتہائی مہنگا اور امریکی معیشت کے لیے اب ناقابل برداشت ہوتا چلا جارہا تھا۔امریکہ کو اب یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ امریکہ جنگ میں اتنا الجھ کر رہ گیا ہے کہ اب وہ اپنی اقتصادی ترقی پر پوری طرح دھیان نہیں دے پا رہا ہے دوسری طرف چین کی تیز رفتاری نے دنیا کو حیران کر دیا ہے۔

۱۹۷۸ء میں ڈینگ زاؤ پنگ نے چین میں ترقی کے ایک نئے عمل کا آغاز کیا اور یہ نعرہ دیا کہ Socialism with chienes world اس کے بعد چین نے مڑ کر پیچھے نہیں دیکھا جبکہ اس کے برعکس امریکہ نے اپنی جنگی صنعت کے دباؤ میں آ کر دنیا کے تقریباً ہر خطے میں جنگی جنون کو بڑھاوا دے کر پوری دنیا کو ایک جنگی صورت حال میں مبتلا کر کے رکھ دیا۔افغانستان بھی اسی جنگی جنون کا نشانہ بنا امریکی صدر ٹرمپ سوویت یونین کے آخری حکمران گورباچوف کی طرح فوری طور پر نکالنے کے حق میں ہے جبکہ امریکی پینٹا گون روسی بیوروکریسی کی طرح اس کے فیصلے کی حمایتی نظر نہیں آتی۔ بالآخر تمام تر الجھنوں کے باوجود افغانستان سے امریکی فوجوں کی واپسی اب ایک حقیقت بن چکی ہے اور یہ عمل اب جلد مکمل ہونے جارہا ہے لیکن ہمیں زیادہ دلچسپی اس صورت حال سے ہونی چاہیے جو کہ امریکی افواج کی واپسی کے بعد ممکنہ طور پر سامنے آسکتی ہے

امریکی افواج کی افغانستان میں موجودگی کے عرصے میں طالبان کی امریکہ سے جہاں براہ راست لڑائی تھی تو دوسری طرف خطے کے بیشتر ممالک نے طالبان کے ساتھ براہ راست یا پھر بالواسطہ تعلقات کو برقرار رکھا۔چین روس اور ایران نے بھی طالبان سے مکمل قطع تعلق نہیں کیا۔انہیں بھی اندازہ تھا کہ اس جنگ کا بالآخر نتیجہ امریکی افواج کی ناکامی اور واپسی کی صورت میں ہوگا اور امریکی انخلاء کے بعد دوسری قوتوں کے ساتھ ساتھ طالبان بھی اپنا اثر رسوخ برقرار رکھ سکیں گے اس لیے طالبان کے ساتھ مکمل طور پر تعلقات کا خاتمہ کوئی اچھی حکمت عملی نہیں ہوگی لگتا ہے کہ ان ممالک کی خارجہ پالیسی اور حکمت عملی کسی حد تک کامیاب ہوتی نظر آرہی ہے۔لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ ممالک طالبان کو اس بات کی اجازت دیں گے کہ وہ ایک بار پھر مکمل طور پر کابل پر قابض ہو کر اپنی ۱۹۹۰ء کی دہائی کی کٹر مذہبی پالیسیاں نافذ کریں جو انتہائی رجعت پسندی پر مبنی تھیں کیا افغانستان کو ایک بار پھر فرقہ وارانہ نسلی اور مذہبی بنیادوں پر تقسیم کر کے اس ملک کو خانہ جنگی اور لڑائی کی طرف دھکیلنے کی اجازت دے دی جائے؟ چین، ایران اور روس کبھی بھی اس صورتحال کے خواہاں نہیں ہوں گے۔چین واخان کے علاقے سے جڑے افغانستان میں کبھی بھی سنکیانگ صوبے کے مسلمان چینی باشندوں کو مذہبی انتہا پسند دیکھنے کا خواہاں نہیں ہوگا اسی طرح روس نے بڑے عرصے تک چیچنیا کے مذہبی انتہا پسندوں سے لڑ کر روس میں انتہا پسندی کا خاتمہ کیا ہے اور اب وہ پھر افغانستان کو ان انتہا پسندوں کی کمین گاہ بنتا

دیکھنا نہیں چاہے گا جبکہ یہی صورتحال ایران کی بھی ہوگی۔

لیکن اس تمام صورت حال میں سب سے پیچیدہ صورت حال پاکستان کے لیے ہوگی پاکستان جو کہ اس وقت امریکہ کے دباؤ میں طالبان کو مذاکرات کی میز پر لے آیا ہے اور بات چیت جاری ہے لیکن اہم سوال یہ ہے کہ پاکستان کا افغانستان پر دیرپا اور مستحکم موقف کیا ہوگا؟

جنرل ضیاالحق کی حکومت نے افغان مسئلہ میں بری طرح الجھ کر اس ملک کو دانستہ طور پر مذہبی انتہا پسندوں کی آگ میں دھکیل دیا اور بعدازاں سوویت یونین کی افواج کے انخلاء کے بعد افغانستان میں کثیر النسلی حکومت کے قیام کے بجائے اپنی مرضی کی حکومت کے قیام کے لیے بضد رہنے کے باعث افغانستان کو خانہ جنگی کی آگ میں دھکیل دیا اس خانہ جنگی نے جہاں ایک طرف افغانستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو پاکستان بھی اس سے بچ نہ سکا۔ گزشتہ سترہ برس میں پاکستان نے اپنے آپ کو بھی غیر مستحکم کر لیا جہاں ایک طرف مذہبی انتہا پسندی کا اژدھا پاکستان پر سوار رہا تو دوسری طرف اقتصادی طور پر ملک دیوالیہ پن کا شکار ہو گیا حکومت پاکستان کے اپنے اعداد و شمار کے مطابق اب تک ۱۳۰ بلین ڈالر سے زیادہ کا نقصان کر چکا ہے جبکہ اس وقت پاکستان کا کل قرضہ سو بلین ڈالرز کے قریب ہے جو ستر برس کے عرصے پر محیط ہے۔ اس طرح یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ پاکستان اگر اپنے آپ کو اس صورت حال میں مبتلا نہ کرتا تو ہماری صورت حال بہت حد تک بہتر ہوگی لیکن بات اب آگے دیکھنے کی ہے۔

پاکستان کے پاس اب ایک جانب دوبارہ صورتحال کو سنبھالنے کا موقع ہے ماضی کی غلطیوں کو نہ دہرانے اور مستقبل میں افغانستان کو اپنے پانچویں صوبے کے طور پر دیکھنے کے بجائے حقیقت کا سامنا کرتے ہوئے افغانستان کے معاملات میں مداخلت بند کر کے اپنے اندرونی معاملات کی طرف دھیان دینے کی ضرورت ہے لیکن ہمیں صورت حال اس سے یکسر مختلف نظر آتی ہے پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ نے ماضی کی غلطیوں سے سبق نہ لیتے ہوئے جہاں ایک طرف ملک کی اندرونی سیاست میں سیاسی انجینئرنگ جاری رکھی ہوئی ہے تو دوسری طرف علاقائی سطح پر اپنی خارجہ پالیسی میں کوئی خاص تبدیلی نہیں کی۔ افغانستان سے خراب تعلقات کے پاکستان پر بڑے برے اثرات مرتب ہوئے ہیں جہاں ایک طرف افغانستان اور پاکستان کے تجارتی تعلقات خراب ہوئے تو دوسری طرف دونوں ملکوں نے ہونے والی دہشت گردی میں ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہرایا لیکن پاکستان کے لیے ایک مزید گمبھیر صورتحال پاکستانی پشتونوں کے حوالے سے پیدا ہو چکی ہے۔

پاکستان نے افغان جہاد میں الجھ کر جہاں پورے ملک میں مذہبی انتہا پسندوں کو بڑھاوا دیا ہے وہاں پشتون معاشرے کی روشن خیالی اور ترقی پسندانہ سیاسی روایات کو تباہ کرتے ہوئے پشتون معاشرے کو دانستہ طور پر مذہبی انتہا پسندی کی آگ میں جھونک دیا۔ خیبر پختونخواہ اور بلوچستان کے سرحدی علاقوں کو جہادیوں کی تربیت گاہوں اور پناہ گاہوں میں بدل کر رکھ دیا بعدازاں ۲۰۰۵ کے بعد ان دہشت گردوں کے حملوں سے مجبور ہو کر جب ان کے خلاف فوجی آپریشن شروع کیے تو اس کے نتیجے میں پشتون آبادی ہی اس صورت حال سے بری طرح متاثر ہوئی انہیں اپنے گھر چھوڑ کر پناہ کے لیے ملک کے مختلف علاقوں میں جانا پڑا جہاں انہیں انتہائی کرب اور اذیت کی صورت حال سے گزرنا پڑا ان کی عزت نفس کو مجروح کیا گیا ان مظلوم پشتونوں نے جب اپنی اس صورت حال پر آواز اٹھانے کی کوشش کی اور ریاست سے انصاف کی اپیل کی تو ان کے اس مطالبے کو ریاست کے خلاف بغاوت سے تعبیر کرتے ہوئے ان کے خلاف پروپگنڈہ شروع کر دیا جبکہ ملک کی سیاست میں اپنی بالادستی قائم رکھنے کے لیے اسٹیبلشمنٹ نے ۲۰۱۸ء کے انتخابات میں مذہبی جماعتوں اور دائیں بازو کے عناصر کی پشت پناہی کی تاکہ ایسی جماعتوں کو انتخابی عمل میں کامیابی حاصل کرنے سے روکا جاسکے جو پاکستان کی خارجہ پالیسی اور اندرونی سیاست میں مذہب کے عمل دخل کو ختم کرنے کی خواہش مند تھیں۔ پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ نے اپنی بالادستی قائم رکھنے کے لیے ملک میں مذہبی انتہا پسندی کو ہوا دی اور اب بھی انہیں اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرنے کے خواہش مند ہیں۔

افغانستان کے اس مسئلے کے حل کے دوران پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ کو ایک اہم فیصلہ کرنا ہوگا پاکستان کو افغانستان میں مذہبی انتہا پسندوں کو ایک بار پھر منصب اقتدار پر بٹھا کر پاکستان کے پشتونوں کی تحریک کو کمزور کرنے کی منصوبہ بندی کے بجائے ملک کے اندرونی مسائل کا منصفانہ حل تلاش کرنا چاہیے ملک کے وسائل خانہ جنگی کے اخراجات کی نذر کرنے کے بجائے سماجی انصاف اور عوامی فلاح کی طرف دھیان دینا چاہیے تو دوسری طرف افغانستان میں بھی ایسے ہی گروہوں کا ساتھ دینا چاہیے جو کہ افغانستان کو ایک بار پھر دہشت گردوں اور مذہبی انتہا پسندوں کا گڑھ نہ بنا دیں۔ یقیناً چین اور روس اس بار پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کو راہ راست پر رکھنے کی کوشش کریں گے لیکن ساتھ ہی ساتھ پاکستان کے روشن خیال حلقوں کو بھی ریاست کے بڑھتے ہوئے اثر و نفوذ کے خلاف جدوجہد جاری رکھنی ہوگی پاکستانی ریاست کی شہری آزادیوں اور اظہار رائے کی آزادی کو دبانے کی کوشش کی بھرپور مزاحمت کرنی چاہیے ایک پرامن اور روشن خیال جنوبی ایشیا پورے خطے کے حق میں ہے۔ ☆

کمیونزم اور فیمنزم ۔۔۔ کچھ نکات

شاداب مرتضیٰ

فیمنسٹ تھیوری کے مطابق ہر طبقے کی عورت اپنے طبقے کے مرد کی بالادستی اور جبر کا (پدرشاہی) کا شکار ہے خواہ اس کا تعلق سرمایہ دار طبقے سے ہو، جاگیردار طبقے سے، مڈل کلاس سے یا مزدور اور محنت کش طبقوں سے۔ عورت سب سے زیادہ مظلوم سماجی "طبقہ" ہے کیونکہ یہ تمام طبقوں کے مردوں کے استحصال کا شکار ہے۔ اس لیے سب سے پہلا، بنیادی اور ضروری کام یہ ہے کہ عورت کو آزاد کیا جائے۔ جب تک تمام طبقوں کی عورتیں اپنے طبقوں کے مردوں کے جبر سے آزاد نہیں ہو جاتیں تب تک عورت بحیثیتِ مجموعی آزاد نہیں ہوگی۔ اور جب تک عورت آزاد نہیں ہوگی سماج آزاد نہیں ہوگا۔ گویا عورت کے استحصال کا خاتمہ اور اس کی آزادی سماج سے تمام استحصال کے خاتمے اور پورے سماج کی آزادی کی بنیادی شرط ہے۔ عورت، عورت اور صرف عورت فیمنزم کا مرکزِ فکر ہے. حتی کہ سوشلزم میں بھی اس کا محور و مرکز عورت ہے اور عورت بھی تمام طبقوں کی عورت جبکہ سوشلزم مزدور طبقے کی آمریت کا طبقاتی نظریہ ہے۔ یہ بین الطبقاتی جدوجہد کا، طبقاتی مصالحت کا قطعی مخالف ہے۔ سوشلزم کے نزدیک عورت بھی طبقوں میں تقسیم ہے۔

مزدور طبقے کی عورت سرمایہ دار کے لیے بھی محنت کرتی ہے اور اپنے خاندان کے لیے گھریلو محنت بھی کرتی ہے۔ یہ بلا معاوضہ محنت ہوتی ہے۔ بعض صورتوں میں تو عورت کی محنت کی اجرت یا کام کی تنخواہ اس کے مرد کو ملتی ہے۔ کسان عورت کھیتی باڑی بھی کرتی ہے اور گھریلو محنت بھی۔ مزدور اور کسان عورتوں کو ان کی گھریلو محنت کا معاوضہ نہیں ملتا جبکہ ان کی گھریلو محنت مردوں کو مزید محنت کے قابل بناتی ہے۔ مزدور اور محنت کش طبقوں کی عورتیں دوہرے استحصال کا شکار ہیں۔ یہ بات درست ہے۔

مڈل کلاس طبقے کی عورت کو ملکیت میں مساوی حصہ نہیں ملتا۔ وہ اکثر پسند کی شادی بھی نہیں کر سکتی۔ وہ اپنی زندگی کے معاملات پر فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں رکھتی۔ اس کے مرد یہ فیصلے کرتے ہیں اور وہ انہیں قبول کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ یہ بات بھی درست ہے۔

جاگیردار طبقے کی عورت قرآن سے بیاہ دی جاتی ہے۔ اسے گھر سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اسے جائیداد میں حصہ نہیں دیا جاتا۔ شادی کے نام پر اس کا جنسی استحصال ہوتا ہے۔ یہ بھی درست بات ہے۔

یہ سب باتیں درست ہیں۔ لیکن سرمایہ دار طبقے کی عورت اپنے طبقے کے مردوں کے کونسے ظلم کا شکار ہے؟ وہ بزنس کرتی ہے، سیاست کرتی ہے، اپنی زندگی کے فیصلے خود کرتی ہے، آزادانہ زندگی بسر کرتی ہے۔ سرمایہ دارانہ سیاسی جماعتوں میں اہم عہدوں پر فائز عورتیں، اسمبلی میں موجود عورتیں، وزارتوں کی سربراہ عورتیں، اعلی ترین سرکاری عہدوں پر فائز عورتیں، وغیرہ وغیرہ، آزاد عورتیں ہیں۔ سو، یہ بات بالکل غلط ہے کہ، تمام طبقوں کی ساری عورتیں اپنے طبقے کے مردوں کا ظلم و جبر بھگت رہی ہیں۔ اور یہ بات بھی درست نہیں کہ حکمران طبقے کی عورتیں بھی اپنے طبقے کے مردوں کے ظلم کا شکار ہیں۔

پاکستان کے کسی بھی بڑے شہر کی مارکیٹ کے باہر کھڑے ہو کر دیکھیں تو آپ کو ایسی سینکڑوں عورتیں نظر آئیں گی جو کار چلا کر آتی ہیں اور مارکیٹوں سے اپنی پسند کی خریداری کرتی ہیں۔ اپر اور مڈل مڈل کلاس کی یہ عورتیں بھی اپنی معاشی حیثیت کے مطابق اپنی زندگی کے فیصلے کرنے میں آزاد ہیں۔ وہ مڈل کلاس گھرانے جن میں مرد اور عورت دونوں ملازمت کرتے ہیں وہاں بھی بہت سی عورتیں آزاد ہیں۔ سو یہ بات بھی درست نہیں کہ مڈل کلاس میں سب عورتیں مردوں کے ظلم کا شکار ہیں۔

جاگیردار، مڈل کلاس اور مزدور و کسان طبقے کی بہت سی عورتیں اپنے مردوں کی بالادستی کے نرغے میں ہیں۔ لیکن سرمایہ دار طبقے کی عورت آزاد ہے۔ نہ صرف یورپ و امریکہ میں بلکہ پاکستان میں بھی۔ عورت بھی طبقوں میں تقسیم

ہے۔ سرمایہ دار طبقے کی عورت اپنے طبقے کے مفادات میں پیوست ہے کیونکہ اسے عیش و آرام کی زندگی چاہیے خواہ اس کی خاطر لاکھوں لوگ بھوکے سوئیں اور غربت میں سڑیں۔ اسے اپنی طبقاتی حیثیت برقرار رکھنی ہے۔ وہ سرمایہ دارانہ نجی ملکیت کی وراثت میں شریک ہے۔ اگر کہیں اسے خاندانی نجی ملکیت میں مساوی حصہ نہیں ملتا تو اس کے لیے جدوجہد کرنا کم از کم کمیونسٹوں کا فرض تو بالکل بھی نہیں ہے۔

کمیونسٹ تو نجی ملکیت کو ہی ختم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ نجی ملکیت میں، نجی خاندانی وراثت میں، سرمایہ دار یا مڈل کلاس کی عورت کے حق یا مساوی حق کے لیے کیوں جدوجہد کریں گے؟ کمیونسٹ جاگیردار طبقے کو (جو کہ اب معاشی طور پر زرعی سرمایہ دار ہے)، سرمایہ دار طبقے کو، الغرض تمام طبقوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ جاگیردار طبقے یا سرمایہ دار طبقے یا مڈل کلاس طبقے کی عورت کے خاندانی وراثت و نجی ملکیت کے حقوق یا مساوی حقوق کے لیے جدوجہد کیوں کریں گے؟ کیا کمیونسٹ سرمایہ دار، مڈل کلاس یا جاگیردار طبقے کے مردوں کے درمیان خاندانی وراثت کے جھگڑوں کو سلجھاتے ہیں؟

قانونی اور عملی طور پر عورتوں کو مرد کے مساوی حقوق کس طرح حاصل ہوں گے جب تک سرمایہ دارانہ نظام موجود ہے؟ جب تک مزدور طبقہ ریاست کا اقتدار حاصل کر کے نئے قوانین بنانے اور نافذ کرنے کا سیاسی و قانونی اختیار حاصل نہیں کر لیتا (سوشلزم) وہ جاگیردار، سرمایہ دار اور مڈل کلاس طبقوں کا خاتمہ کرنے کے قابل کیسے ہو سکے گا؟ کیا اس سے پہلے یہ ممکن ہے کہ عورت کا استحصال ختم کیا جا سکے؟

کمیونسٹوں کا نصب العین سوشلسٹ انقلاب ہے فیمنسٹ انقلاب نہیں۔ کمیونسٹ مزدور طبقے کو سوشلسٹ انقلاب کے لیے تیار کرتے ہیں فیمنسٹ انقلاب کے لیے نہیں۔ کمیونسٹ مزدور طبقے کی نظریاتی تعلیم اور سیاسی رہنمائی میں سوشلزم کو، پرولتاریہ کی آمریت کو، سوشلسٹ انقلاب کو محور و مرکز بناتے ہیں فیمنزم کو نہیں۔ کمیونسٹ مزدور عورتوں کو، دیگر محنت کش عورتوں کو اور عورتوں کو عمومی طور پر سوشلسٹ انقلاب کی جانب راغب کرتے ہیں فیمنسٹ انقلاب کی جانب نہیں کیونکہ سوشلسٹ انقلاب کے بغیر عورت نجی ملکیت اور پدرشاہی نظام کے جبر سے آزاد ہو ہی نہیں سکتی۔

سماج سوشلسٹ انقلاب سے آزاد ہو گا یا فیمنسٹ انقلاب سے؟ کس انقلاب کو اولیت حاصل ہے؟ سوشلسٹ انقلاب کو یا فیمنسٹ انقلاب کو؟ کونسا انقلاب کس سے مشروط ہے؟ عورت کی نجات، فیمنسٹ انقلاب، سوشلسٹ انقلاب یعنی طبقاتی نظام کے خاتمے سے، طبقوں کے خاتمے سے مشروط ہے یا سوشلسٹ انقلاب یعنی طبقاتی نظام کا خاتمہ، طبقوں کا خاتمہ، نجی ملکیت کا خاتمہ، فیمنسٹ انقلاب سے مشروط ہے؟ کیا فیمنسٹ انقلاب سے، صرف پدرشاہی نظام کے خاتمے سے طبقاتی نظام کا، طبقوں کا، نجی ملکیت کا خاتمہ ہو جائے گا؟ ظاہر ہے سوشلزم کو فیمنزم پر فوقیت حاصل ہے کیونکہ عورت بھی طبقوں میں تقسیم ہے: پرولتاریہ عورت اور سرمایہ دار عورت۔ فیمنزم عورتوں کی طبقاتی تقسیم کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک صنفی تفریق بنیادی اور طبقاتی تفریق ثانوی ہے۔

کونسی تقسیم زیادہ اہم ہے؟ طبقاتی تقسیم یا صنفی تقسیم؟ فیمنزم کے نزدیک صنفی تقسیم کو اولیت حاصل ہے۔ سوشلزم کے نزدیک طبقاتی تقسیم سماجی مسائل، بشمول عورت کے استحصال، کی بنیاد ہے۔ فیمنزم کی غلطی یہ ہے کہ یہ نجی ملکیتی نظام کے بجائے پدرشاہی نظام کو عورت کے استحصال کی جڑ سمجھتا ہے۔

عورت آزاد کیسے ہو گی؟ نجی ملکیتی طبقاتی نظام میں صرف صنفی تفریق کے خاتمے سے یا نجی ملکیتی طبقاتی نظام کے خاتمے سے؟ صنفی تفریق، مرد اور عورت کی نابرابری، عورت پر مرد کی بالادستی کا سبب ان کی مختلف صنف ہے یا نجی ملکیت؟ ظاہر ہے نجی ملکیت۔ کیا جاگیردار گھرانے کی عورت خاندانی ملکیت کی وارث بن کر زمین کو کسانوں میں تقسیم کر دے گی؟ یا سرمایہ دار گھرانے کی عورت خاندانی ملکیت کی وارث بن کر اپنی صنعتیں اور کاروبار مزدوروں کے حوالے کر دے گی؟

سرمایہ دارانہ نظام طبقاتی اور صنفی استحصال کا دوہرا نظام ہے۔ یہ بالکل درست بات ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس دوہرے نظام کے دوہرے استحصال کا شکار کونسا طبقہ ہے؟ کیا سرمایہ دار مرد اور عورت بھی اپنے ہی نظام کے استحصال کا شکار ہیں؟ یہ بات ایک فرضی قصے سے زیادہ کچھ نہیں کہ سرمایہ دار طبقے کی عورت

اور بالائی درمیانی طبقے کی تمام عورتیں پدرشاہی جبر کا شکار ہیں۔

کیا سوشلزم عورت کی نجات کا دعویدار نہیں؟ کیا سوشلزم نے ہر جگہ جہاں بھی اسے اقتدار نصیب ہوا، عورت کے استحصال کا خاتمہ، پدرشاہی کا خاتمہ نہیں کیا؟ سوشلزم نے عورت کی آزادی اور نجات کے اپنے دعوے کو ہمیشہ نبھایا ہے۔ اور صرف سوشلزم نے ہی اس دعوے کو پورا کیا ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں کمیونسٹ تحریک میں بار بار عورت کے سوال کو، فیمنزم کو ابھارنے کی، اس پر اصرار کرنے کی اور عورتوں کو کمیونسٹ تحریک اور سوشلسٹ انقلابی تحریک سے جوڑنے کے لیے فیمنزم پر، صرف عورتوں کے حقوق پر، طبقاتی تقسیم سے ماورا تمام طبقوں کی عورتوں کے حقوق پر (!) اصرار مسلسل کی اور کمیونسٹ عورتوں کو صرف عورتوں کے حقوق کے لیے کام کرنے پر راغب کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ سوشلزم کے بارے میں یہ گمراہ کن ابہام پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہے کہ سوشلزم صرف طبقاتی امتیاز کو ختم کرتا ہے (یعنی اسے عورت کے صنفی استحصال سے کوئی دلچسپی نہیں) جب کہ صنفی امتیاز کے، عورت کے استحصال کے خاتمے کا فریضہ فیمنزم نبھاتا ہے؟ دنیا میں آج تک کہاں فیمنزم نے عورت کے استحصال کا خاتمہ کیا ہے؟ فیمنسٹ تحریک سرمایہ دارانہ نظام کے دقیانوسی فریم ورک میں رہتے ہوئے عورت کی جزوی آزادی، سرمایہ دار طبقے اور مڈل کلاس عورت کی صنفی آزادی، مزدور طبقے کی عورتوں کی اجرتی غلامی کی طبقاتی آزادی اور عمومی طور پر عورت کی آزادی کی انفرادیت پسندانہ اور تجریدی اصلاح پسندانہ تحریک سے آگے کہاں گئی ہے؟

فیمنزم اور کمیونزم/سوشلزم/مارکسزم میں کیا مشترک ہے؟ فیمنزم عورتوں کی طبقاتی تقسیم کو تسلیم نہیں کرتا۔ کمیونزم عورتوں کی طبقاتی تقسیم کو تسلیم کرتا ہے۔ فیمنزم تمام عورتوں کے تمام حقوق کا علمبردار ہے۔ کمیونزم مزدور اور محنت کش طبقوں کی عورتوں کے طبقاتی حقوق کا علمبردار ہے۔ فیمنزم جاگیردار اور سرمایہ دار طبقوں کی عورتوں کے حقِ نجی ملکیت کا قائل ہے۔ کمیونزم نجی ملکیت کے خاتمے کا علمبردار ہے۔ فیمنزم سماجی انقلاب کے لیے عورت کی آزادی کو اولین شرط سمجھتا ہے۔ کمیونزم سماجی انقلاب کے لیے مزدور طبقے کی آمریت کو بنیادی اہمیت دیتا ہے۔ فیمنزم عورتوں کو مرد سے آزادی کی ترغیب دیتا ہے۔ کمیونزم عورتوں کو مردوں کے ساتھ مل کر مزدور طبقے کے جدوجہد میں شریک ہو کر سرمایہ دارانہ نظام اور اس کی نجی ملکیت سے آزادی کی ترغیب دیتا ہے۔ فیمنزم سوشلسٹ تحریک کو عورت کی بین الاطبقاتی نجات کے یوٹوپیا کی جانب کھینچنے کی کوشش کرتا ہے۔ کمیونزم عورتوں کو، ان کی آزادی کو، سرمایہ دار طبقے کی آمریت کے خاتمے کے لیے مزدور طبقے کی جدوجہد سے، سوشلسٹ انقلاب کی جدوجہد سے جوڑتا چاہتا ہے۔ نظریاتی طور پر بھی اور حکمتِ عملی کے اعتبار سے بھی کمیونزم اور فیمنزم ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ فیمنزم بھلے ہی خود کو سوشلسٹ یا مارکسسٹ بنا کر پیش کرے لیکن اس کی نظریاتی بنیادیں کمیونزم/سوشلزم/مارکس ازم کے بنیادی اصولوں سے انکار پر قائم ہیں۔

۔عورت کی صنفی آزادی سماج کی آزادی کی ضامن نہیں۔ عورت کی طبقاتی آزادی اس کی صنفی آزادی کی پہلی شرط ہے۔ اور طبقاتی نظام سے سماج کی آزادی مزدور طبقے کی آمریت سے مشروط ہے۔ جب تک مزدور طبقہ آزاد نہیں ہوتا سماج میں موجود کوئی بھی استحصال زدہ طبقہ آزاد نہیں ہوسکتا۔ اس لیے سماج کی آزادی، عورت کی آزادی، تمام مظلوموں کی آزادی مزدور طبقے کی آمریت پر منحصر ہے۔ اور کمیونزم/سوشلزم/مارکسزم کا محور اسی لیے پرولتاریہ کی آمریت ہے۔ اور اسی سبب سے کمیونسٹوں کا نصب العین مزدور طبقے کی آمریت کے قیام کے لیے اپنی تمام کاوشوں کو وقف کر دینا ہے نہ کہ فیمنزم کے دائرہِ کار میں رہتے ہوئے عورتوں کی صنفی آزادی کی خاطر پدرشاہی نظام کے خاتمے کے لیے تمام طبقوں کی عورتوں کے تمام حقوق کے لیے جدوجہد میں اپنی توانائیاں ضائع کرنا۔ مزدوع طبقے کی آمریت، سوشلزم، عورت کے استحصال کو اور پدرشاہی نظام کو خاک میں ملا دی گی۔ اس کے لیے کمیونسٹوں کو فیمنزم کے لبرل سرمایہ دارانہ نظریے کی ضرورت نہیں۔ عورت کی آزادی کے سوال پر سوشلزم فیمنزم سے زیادہ ترقی یافتہ اور فیمنزم کی طرح معروضی عینیت پسند نہیں بلکہ سائنٹفک نکتہِ نظر اور حکمتِ عملی رکھتا ہے۔ کمیونسٹوں کا کام فیمنزم کا پرچار نہیں بلکہ مزدور طبقے میں جا کر انہیں بلا لحاظِ صنف سرمایہ دارانہ نظام سے جنگ کے لیے تیار کرنا ہے۔

.....☆.....

معاشرے کے ہاتھوں میں کیسے پوسٹر ہیں؟

غازی صلاح الدین

سب سے پہلے ایک اعتراف کہ جسے کوئی اعترافِ جرم بھی سمجھے وہ یہ کہ میں خواتین کے اس مارچ میں شامل تھا جو کراچی میں خواتین کے عالمی دن یعنی آٹھ مارچ کو فریئر ہال کے سبزہ زار پر منعقد ہوا اور یہ اقرار بھی کہ مجھے وہاں ہونا اچھا لگا اس کا ایک جواز میری نظر میں یہ ہے کہ خواتین کی سماجی اور جمہوری آزادی کی تحریک مردوں کی شراکت کے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتی دراصل تو یہ معاشرے کی ترقی، آزادی اور خوشحالی کا مسئلہ ہے سو یہ ذمے داری صرف خواتین پر نہیں چھوڑی جاسکتی یہ مثال دیکھیے کہ میڈیا کی آزادی بھی تو دراصل معاشرے کی آزادی ہے تو پھر اس آزادی کی جدوجہد میڈیا کے کارکن اکیلے کیوں کرتے ہیں؟ یہ کام تو سول سوسائٹی کا ہے کہ وہ اپنے حقوق کا مطالبہ کرے کہ جن کا حصول صرف ایک ذمہ دار اور آزاد میڈیا کے توسط سے ہی ممکن ہے خیر بات خواتین مارچ کی ہورہی ہے اس مارچ میں چند بلکہ صرف انگلیوں پر گنے جانے والے پوسٹر ایسے تھے جن کی معنوی برہنگی نے ایک طوفان برپا کردیا ہے خواتین نے جو پلے کارڈ اٹھائے تھے ان پر جائز مطالبات کے ساتھ ساتھ صنفی برابری اور ازدواجی رشتوں کے حوالے سے کافی دلچسپ اور طنز آمیز فقرے بھی شامل تھے۔ میں نے تو وہاں سوچا کہ کوئی ان تمام تحریر شدہ نعروں کو اکٹھا کرے تو ایک یادگار کتاب بن جائے جو معاشرتی تبدیلی کے اہم موڑ کی دستاویز ہو۔ ۱۹۶۸ء میں یورپ بلکہ خاص طور پر پیرس میں نوجوانوں نے جو بغاوت کی تھی تو دیواروں پر لکھے ہوئے ان کے نعرے عوامی ادب کا حصہ بن گئے تھے ان میں بھی بدتمیزی اور سرکشی کا بیباک اظہار تھا۔ احتجاج میں اکثر جوش اور غصے کی ملاوٹ تو ہوتی ہے۔ اچھا وہ جو چند شعلہ فشاں اور چونکا دینے والے پوسٹر تھے تو سچی بات یہ ہے کہ میں انہیں دیکھ کر حیران نہیں ہوا اسی طرح ان پر ہونے والے شدید ردعمل سے بھی حیران نہیں ہوا جو موجودہ صورتحال ہے اور اس میں سوشل میڈیا کی بیہودگی بلکہ غلاظت کا بھی دخل ہے اس میں اظہار اور مطالبوں کی سرحدیں باقی نہیں رہی ہیں ان چند پوسٹروں سے پیدا ہونے والی کشیدگی میں اضافہ ہوا اسی لیے میں نے اپنے کالم کے لیے گزرے ہوئے ہفتے کے موضوع کا انتخاب کیا تھا جیسا کہ میں نے کہا جو کچھ ہورہا ہے وہ تو ہونا ہے مشکل یہ ہے کہ جب کسی اختلافی مسئلہ پر دونوں جانب کے انتہا پسند میدان میں اتر آئے ہوں تو مکالمہ نہیں ہوتا ایسی جنگ ہوتی ہے جس میں حقائق اور عقل کا ہتھیار ناکارہ ہوجاتا ہے مکالمہ صرف ایک جانب کے اعتدال پسند دوسری صف کے اعتدال پسندوں سے کرسکتے ہیں اور ہمارے معاشرے میں ہر سطح پر مکالمے کی ضرورت ہے یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ ایک طرف کے انتہا پسند دوسری طرف کے انتہا پسندوں کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ یوں تو وہ ایک دوسرے کے لیے شدید نفرت کا اظہار کرتے ہیں لیکن درحقیقت وہ ایک دوسرے کے وجود کے ضامن بن جاتے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کی سیاست کا میں ذکر نہیں کرنا چاہتا اور ذکر نہ کرنے کا معاملہ ہے تو کتنی ہی اور باتیں ہیں کہ جن پر بات نہیں ہوسکتی۔ خواتین کی آزادی کی جدوجہد کسی مارچ اور پوسٹر کی عریانی تک محدود نہیں کی جاسکتی۔ ایک پیچیدگی یہ ہے کہ انٹرنیٹ اور اسمارٹ فون کے اس انقلاب کے بعد کہ جس کے مضمرات کو بھی ہم ابھی سمجھ نہیں پائے ہیں ہمارا تقلید پسند معاشرہ بکھرتا جارہا ہے اور ہم تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا سے سمجھوتہ کرنے کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتے۔

اب آپ یہ بتائیے کہ دنیا میں کتنے دوسرے ایسے معاشرے ہیں جن میں غیرت کے نام پر اتنے قتل ہوتے ہیں اور جہاں نوجوان لڑکیوں کو محبت کرنے یا اپنی پسند کی شادی کرنے کے جرم میں ان کے اپنے بھائی اور باپ بے دردی سے قتل کر دیتے ہیں۔ کاروکاری کے واقعات شاید اسی لیے بڑھتے دکھائی دیتے ہیں کہ رسم و رواج کی زنجیروں میں بندھی لڑکیاں اب زیادہ تعداد میں بغاوت پر آمادہ ہیں لیکن یہ سوچ کر جسم میں تھرتھری پیدا ہوتی ہے کہ کراچی ایسے نام نہاد روشنیوں کے شہر میں یہ بھی ممکن ہے پسند کی شادی کرنے والے ایک جوڑے کو کوئی جرگہ موت کی سزا سنائے اور اس پر نہایت وحشیانہ انداز میں عمل بھی کیا جائے بار بار ہم ایسی خبریں پڑھتے ہیں اور چند واقعات تو ایسے ہیں کہ جو اس پورے معاشرے کی بے

غیرتی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں آپ یہ بھی تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ وہ پوسٹر ہیں جو معاشرہ اپنے ہاتھوں میں تھامے ہے۔اور آپ خود فیصلہ کریں کہ اس پوسٹر پر لکھی ہوئی تحریر کتنی شائستہ یا کتنی غلیظ ہے۔

اس وقت جو گفتگو ہو رہی ہے اس کا مرکز خاص طور پر وہ خواتین ہیں جو آزادی اور خودمختاری کی دوڑ میں بہت آگے چلی گئی ہیں عام حالات میں خواتین کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے اور مجموعی طور پر خواتین کی حیثیت کیا ہے اس کا اتنا ذکر نہیں ہے۔موجودہ حالات کے اپنے کچھ تقاضے ہیں لیکن یہ جدوجہد تو برسوں سے جاری ہے آپ کو یاد ہوگا کہ جب مجاز نے ایک نوجوان خاتون سے یہ کہا تھا کہ ترے ماتھے پہ یہ آنچل تو بہت ہی خوب ہے لیکن تو اس آنچل سے ایک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا۔

یہ نظم ۱۹۳۷ میں یعنی ۸۰ سال سے بھی پہلے لکھی گئی تھی اور ترقی پسند روشن خیال تحریک اب کئی منزلیں سر کر چکی ہے۔فہمیدہ ریاض کے انتقال کو ابھی چند ماہ گزرے ہیں اور ان کی شاعری نے بھی عورتوں کی آزادی کا پرچم بلند کیا' دنیا کی بات کرنے کا یہاں موقع نہیں صرف یہ یاد رہے کہ آزاد مغرب میں بھی ''می ٹو'' کی تحریک نے گزشتہ دو تین سالوں میں معاشرے کو تبدیل کر دیا ہے جسے ہم پدر شاہی کہیں اس کے قلعہ میں شگاف پڑ رہے ہیں ٹرمپ کے امریکہ میں گزشتہ سال نومبر میں ایوان نمائندگان کے انتخاب میں ۱۰۲ خواتین کامیاب ہوئیں جو ایوان کی تقریباً ایک چوتھائی تعداد ہے ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا ان میں چند سرکش نوجوان خواتین نمایاں ہیں اس ایوان نے جنوری میں اپنی ٹرم کا آغاز کیا۔ہمارے لیے سب سے بڑی خبر یہ ہے کہ پہلی بار دو مسلمان خواتین نے بھی حلف اٹھایا' ایک فسلطینی خاتون رشیدہ طالب ہیں اور دوسری کا تعلق صومالیہ سے ہے ان کا نام الحان عمر ہے۔اب جو فحش پوسٹر کی بات ہے تو رشیدہ صاحبہ نے حلف لینے کے بعد اپنی گفتگو میں ٹرمپ کو منہ بھر کر ماں کی گالی بھی دی کچھ شور مچا ان کی ڈیموکریٹک پارٹی نے بھی برا مانا مگر رشیدہ نے اپنے الفاظ واپس نہیں لیے☆

سعودی ولی عہد کا دورہ پاکستان

بابر ایاز

وزیراعظم عمران خان اور چیف آف آرمی اسٹاف جنرل قمر جاوید باجوہ دونوں کی تعلقات عامہ (پی آر) کی ٹیموں نے سعودی ولی عہد شہزادہ محمد بن سلمان کے دوروزہ دورۂ پاکستان کی کامیابی کے کریڈٹ کا دعویٰ کیا ہے جس سے ملک میں سول اور ملٹری توازن کی جھلک نظر آتی ہے اگر میاں نواز شریف وزیراعظم ہوتے تو شاید خارجہ پالیسی کی کامیابی پر اعزاز کی ایسی حصے داری ممکن نہ ہوتی۔

محمد بن سلمان کے ساتھ ایک سو سے زیادہ سعودی تاجر تھے۔پاکستان اور سعودی عرب نے دیگر کے علاوہ معدنیات' کیمیکلز' زراعت اور فوڈ پراسیسنگ' سمیت کئی شعبوں میں 21 ملین ڈالر سے زیادہ مالیت کی یادداشتوں پر دستخط کیے۔ان میں گوادر میں ایک آئل ریفائنری' پیٹروکیمیکلز انڈسٹریز بھی شامل ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ سعودی خام تیل گوادر پہنچایا جائے گا۔یہ اس بندرگاہ کے لیے جس کا انتظام چینیوں کے پاس ہے بزنس کا ایک اچھا موقع ہوگا۔سعودی سرمائے سے لگائی جانے والی آئل ریفائنری کو چینی صوبے ژنجیانگ کی توانائی کی مانگ کو پورا کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکے گا۔

دو نئے بجلی گھروں حویلی بہادر شاہ اور بلوکی پاور پلانٹ کو فروخت کرنے کی باتیں بھی ہو رہی ہیں۔پنجاب میں یہ دونوں بجلی گھر پاکستان نے تعمیر کیے تھے۔مختصر مدت کے فائدے کے لیے ان بجلی گھروں کو بیچنا غیر دانشمندانہ اقدام ہوگا کیونکہ پاکستان پہلے ہی غیر ملکی کمپنیوں کا ڈیویڈنڈ ادا کرتا ہے جو زرمبادلہ کے ذخائر پر بوجھ ہے۔فخر سے سرشار حکومت پاکستان میں سعودی سرمایہ کاری کے وعدے پر خوش ہے۔جب فخر کا نشہ اترے گا تو ہو سکتا ہے کہ ہمیں معلوم ہو کہ اس سعودی فراخدلی کے بدلے میں کیا دیا گیا ہے۔جب ان پیکیجز کی شرائط اور ضابطوں کو حتمی شکل دی جائے گی تو امید ہے کہ سعودیوں کے ساتھ یہ ویسی ڈیل دھندلی نہیں رہے گی جیسی کہ چین کے ساتھ کی گئی ہے۔

محمد بن سلمان نے بھارت کے ساتھ 44 بلین ڈالر مالیت کے معاہدوں پر دستخط کیے۔ان کا اقتصادی ماڈل یہ ہے کہ مسلسل تیل کی آمدنی پر انحصار نہ کیا جائے بلکہ دیگر ممالک میں سرمایہ کاری کی جائے۔سیاحت کی صنعت میں سعودی سرمایہ کاری کو پھیلا جائے۔سعودی عرب اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ وہ دنیا کے دو ارب مسلمانوں کے لیے مذہبی سیاحتی کشش رکھتا ہے۔

سرکاری طور پر یہ کہا گیا کہ سابق حکومت نے سعودی عرب کے ساتھ تعلقات کو نظر انداز کیا اور تعلقات کچھ دباؤ میں رہے۔ دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات معمول پر لانے کے لیے آرمی چیف اور عمران خان نے متعدد دورے کیے۔ پاکستان اور سعودی عرب کے درمیان تعلقات اس وقت دباؤ میں آئے جب پاکستان نے سعودی یمن تنازعے میں کسی مدد دینے سے انکار کیا۔ پاکستان کو یہ فکر لاحق تھی کہ اگر اس نے یمن تنازعہ میں کوئی فعال کردار ادا کیا تو ایران کے ساتھ اس کے تعلقات خراب ہوں گے جو اس کا مغربی پڑوسی ہے۔ تاہم حکومت نے جنرل راحیل شریف کو اسلامی ملٹری کاؤنٹر ٹیررازم کولیشن فورسز کی سربراہی کرنے کی اجازت دے دی۔ حال ہی میں ایرانی حکومت نے الزام لگایا کہ ایک دہشت گرد گروپ نے 13 فروری کو ایران پاسدران انقلاب پر حملہ کیا جس میں 27 گارڈ مارے گئے اور 13 زخمی ہوئے۔ وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی نے اپنے ایرانی ہم منصب جواد ظریف سے فون پر بات کرتے ہوئے اس حملے کی مذمت کی اور تحقیقات کے لیے تعاون کی پیش کش کی۔ ایران کے خدشات پر بات چیت کے لیے ایک پاکستانی وفد تہران بھی جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکا اور اسرائیل کی طرف سے ایران کو تنہا کیا جارہا ہے اس کی تازہ مثال یہ ہے کہ مشرق وسطیٰ کی سلامتی کے بارے میں وارسا میں امریکا اور پولینڈ کی طرف سے مشترکہ طور پر منعقد کی جانے والی کانفرنس میں تمام ایران مخالف قوتیں جمع ہوئیں اور انہوں نے ایران کے جوہری پروگرام پر خوب لے دے کی۔ اس کے ساتھ ہی پلوامہ میں ایک حالیہ بم حملے میں جس میں 44 بھارتی فوجی ہلاک ہوگئے تھے بھارت نے فوری طور پر جیش محمد پر الزام عائد کردیا حالانکہ جیش محمد پر پابندی لگی ہوئی ہے بھارت نے 2016 میں پٹھان کوٹ میں ایک حملے کے واقعے میں بھی اس تنظیم کے لیڈر کا نام لیا تھا اگرچہ وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی نے ایران اور بھارت دونوں ملکوں میں حملوں کی مذمت کی ہے مگر دنیا پاکستان پر اعتماد نہیں کرتی جب بھی پاک بھارت تعلقات میں تھوڑی سی پیش رفت ہوتی ہے افغان طالبان مذاکرات آگے بڑھتے ہیں تو کچھ نہ کچھ ایسا ہوجاتا ہے جس سے پاکستان کے لیے مسائل پیدا ہوجاتے ہیں۔ سعودی عرب جو امداد دیتا ہے اس کی وجہ سے پاکستان ہمیشہ زیر بار ہی رہا ہے سعودی عرب کے پاس پیٹرو ڈالر ہے حتیٰ کہ صدر ٹرمپ نے اعتراف کیا کہ سعودی عرب تیل کی زیادہ پیداوار سے قیمتوں کو کم رکھے ہوئے ہے اور سعودیوں نے امریکی ملٹری انڈسٹریلز کمپلکس کو سو بلین ڈالر کے آرڈرز دیے ہوئے ہیں۔ تاہم محمد بن سلمان کے حالیہ دورے سے سب سے زیادہ فائدہ سعودی جیلوں میں قید 2,107 پاکستانیوں کو ہوا جنہیں سعودی عرب حکومت نے عمران خان کی عاجزانہ درخواست پر رہا کردیا۔ سعودی ولیعہد نے بھی بہت تیزی سے کام کیا اور اگلی ہی صبح پاکستانی قیدیوں کی رہائی کے احکامات جاری ہونے لگے کیا ہم خوش قسمت نہیں ہیں کہ سعودی عرب جمہوری ملک نہیں ہے جہاں عدلیہ اور پارلیمنٹ سے غیر ملکی قیدیوں کی رہائی کی منظوری درکار ہوتی بلکہ یہ ایک سلطنت ہے جہاں بادشاہ اور ولی عہد کی حکومت ہے☆

افغانستان میں سرخ سیاست کے احیاء کی کوششیں

اثر امام

1980 اور 1990 کی دہائی میں افغانستان میں جن پر آشوب حالات نے جنم لیا خصوصاً سوویت یونین کی تحلیل اور افغانستان میں طالبان اور دیگر مذہبی دہشتگرد عناصر کی پذیرائی، جس کے نتیجے میں ڈاکٹر نجیب اللہ کو بھی شہید کیا گیا۔ اس کے بعد تو دنیا کو ایسا لگا کہ افغانستان ایک ایسا ملک ہے جس میں سرخ سیاست کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ افغانستان ایک مذہبی معاشرہ ہے اور تا روزِ قیامت ایسا ہی رہے گا۔ لیکن ماضی قریب کے واقعات نے اس سوچ کو غلط ثابت کیا ہے۔ خاص طور پر 2017 کی گرمیوں کے بعد افغانستان میں سرخ سیاست تیزی سے اپنی کھوئی ہوئی پہچان اور حیثیت واپس لے رہی ہے۔ BBC کی رپورٹ کے مطابق 28 جولائی 2017 کو کابل کے ایک ہوٹل میں ہزاروں لوگ اس نیت سے اکٹھے ہوئے کہ حزبِ وطن پارٹی کو پھر سے سرگرم کرنے کے لیے کوئی حکمتِ عملی بنائی جا سکے۔ حزبِ وطن وہی پارٹی ہے جو ایک زمانے میں شہید ڈاکٹر نجیب اللہ اور ان کے ساتھیوں کی پارٹی ہوا کرتی تھی. جس کا انگریزی نام پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی آف افغانستان تھا۔ ابتدائی طور پر 1965 میں PDPA افغانستان کے دانشور حلقے کو تیزی سے متاثر کرنے لگی تھی۔ یہی وجہ

ہے کہ آغاز ہی میں اسکا اثر یونیورسٹیوں، کالجوں اور اسکولوں میں نظر آنے لگا تھا۔ اس کے علاوہ پارٹی نے محنت کش عوام کو بھی مختلف ٹریڈ یونینوں میں سرگرم کرنا شروع کر دیا تھا. لیکن اندرونی اختلافات کے نتیجے میں آگے چل کر پارٹی دو حصوں میں بٹ گئی. ایک حصہ خلق جبکہ دوسرا پرچم کے نام سے پہچانا جانے لگا۔ خلق والے حصے کا رہنما کامریڈ نور محمد ترہ کئی تھا جسے 1979 میں شہید کیا گیا۔ ترہ کئی خود بھی پیشے کے لحاظ سے ایک استاد تھا۔ جب کہ پارٹی کے دوسرے حصے پرچم کا رہنما ببرک کارمل تھا جو بنیادی طور پر ایک شاگرد رہنما تھا۔ 1967 سے 1977 تک پارٹی کے دونوں حصے علیحدہ سیاست کرتے رہے۔

1965 میں جب نئے آئین کی روشنی میں پہلی نسبتاً آزاد اسمبلی بنی تو PDPA کے 4 ایم پی ای منتخب ہوئے تھے۔ 1973 اور 1978 میں پارٹی نے دو مراحل میں اقتدار اپنے قبضے میں لیا تھا، دراصل فوج میں پارٹی سے ہمدردی رکھنے والے خواہ پارٹی ممبر سپاہیوں اور افسروں کی بہت کثیر تعداد نے اس بات کو یقینی اور ممکن بنایا تھا۔ 1978 سے 1987 تک افغانستان PDPA کی حکومت کے تحت قائم رہا۔ لیکن بعد میں جب سوویت افوج افغانستان سے واپس چلی گئیں اور افغانستان میں امریکی پشت پناہی سے جہادی طالبان نے دہشت گرد کارروائیوں کو تیز کر کے حکومت کو عدم استحکام کا شکار بنا دیا تب کامریڈ نجیب اللہ ایک پارٹی کی حکومت کے کمیونسٹ اصول سے پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوا اور عوامی پذیرائی رکھنے والے سیاسی مخالفین کو اقتدار میں حصہ دار بنانے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن ڈاکٹر نجیب کی ان کاوشوں کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ سوویت یونین کا انہدام ہو چکا تھا۔ روس میں بورس یلسن کی حکمرانی تھی۔ جس نے افغانستان کی مالی امداد روک دی تھی۔ جس کی ایک وجہ خود روس میں بحران کی شدت تھی اور دوسری جانب روس اب سوشلسٹ سوویت یونین بھی نہیں تھا بلکہ وہ سرمایہ دار روس بن چکا تھا۔ بہرحال سوویت یونین کی افواج کا افغانستان سے نکل جانا اور روس کی طرف سے مالی امداد روک دینے کے نتیجے میں افغانستان میں انقلابی حکومت بے یارومددگار بن گئی تھی۔ 1992 میں جب نام نہاد مجاہدین کی حکومت قائم ہوئی تو ڈاکٹر نجیب اللہ کی اس پارٹی حزبِ وطن پر پابندی عائد کی گئی۔ 2001 کے بعد کئی بار پارٹی کو نئے سرے سے منظم اور سرگرم کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے لیکن انصاف کی وزارت (جو سیاسی پارٹیوں کو تسلیم یا رد کرنے کا اختیار رکھتی ہے۔) ایسی کاوشوں کو مسلسل رد کرتی رہی ہے۔ اب بھی جب حزبِ وطن کے چاہنے والے اسکو نئے سرے سے کھڑا کرنے کی تیاری کر رہے ہیں تو ان کے سامنے یہ سوال بڑی شدت کے ساتھ سامنے کھڑا ہے کہ حکومتِ افغانستان سے حزبِ وطن کے احیائے ثانی کیلئے اجازت کس طرح لی جائے گی؟

کابل میں بلائے گئے اس اجلاس کا روحِ رواں عبدالجبار قہرمان نامی شخص تھا۔ جو ڈاکٹر نجیب شہید کا ہمعصر اور پرانا کمیونسٹ ہے۔ قہرمان ہلمند سے پارلیمنٹرین بھی منتخب ہوتا رہا ہے۔ اس نے جنوری 2016 میں افغانستان کے صدر کا مشیر بننے سے انکار کیا تھا۔ اس اجلاس میں خطاب کرتے ہوئے قہرمان نے کہا تھا کہ وہ ڈاکٹر نجیب کے سارے پرانے ساتھیوں اور پارٹی کامریڈز کو اپیل کرتا ہے کہ ڈاکٹر نجیب کے خوابوں کی تعبیر کے لیے قومی مفادات کے سامنے ذاتی اور گروہی مفادات کو قربان کر کے سب متحد ہوں۔ اس نے کہا تھا کہ PDPA کے سارے پرانے ساتھی دوبارہ متحد ہوں تا کہ ہم ڈاکٹر نجیب کے نظریے اور فکر کو آگے بڑھا سکیں۔

ڈاکٹر نجیب کی حکومت کے آخری سالوں کے دوران یہ بات محسوس کی گئی تھی کہ افغانستان براہِ راست سوشلزم کے دور میں داخل ہونے سے ابھی بہت دور ہے۔ اس لیے ڈاکٹر نجیب نے صرف اس بنیاد پر سارے وطن دوست اور روشن خیال سیاسی حلقوں کو اقتدار میں حصہ دار بنانے کی پالیسی اختیار کی تھی کہ کسی بھی طرح مذہبی شدت پسندی کو شکست دینی ہے۔ افغانستان میں سامراجی چالبازیوں سے باخبر رہتے ہوئے ملکی ترقی و خوشحالی کی طرف بڑھنا ہے۔ اسکی سوچ کے مطابق افغانستان کے لیے سوشلزم کی طرف جانا ہی ایک سیدھا راستہ تھا۔ آج جب اس کے پرانے ساتھی دوبارہ متحد ہو رہے ہیں تو نہ صرف ان کا دوبارہ اکٹھا ہونا خوش آئند عمل ہے بلکہ وہ ڈاکٹر نجیب کی فکر کو بھی اپنا رہے ہیں، یہ اس سے بھی بڑی خوشی کی بات ہے۔ آج قہرمان بھی یہی سمجھتا ہے کہ افغانستان میں براہِ راست سوشلزم کی بات کرنا قبل از وقت ہوگا۔ چنانچہ ابتدائی مراحل میں وہاں سامراج مخالفت کر کے، سامراجی باشندوں کی جعلی حکمرانی کی بجائے حقیقی عوامی جمہوریت قائم کرنا ہی بہت بڑا انقلابی قدم ہوگا۔ ایمل لیان نامی ایک

دوسرے رہنما نے اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کی پارٹی سینٹر لیفٹ کی پارٹی ہوگی جو دائیں بازو کی سیاست کے برعکس محنت کش طبقات اور مظلوم عوام کے مفادات کی سیاست کریگی جسکے منشور میں عوام کی بڑی اکثریت جو کہ محرومیوں کی گہری کھائی میں گری پڑی ہے، کے مفادات شامل ہیں۔

حزبِ وطن کی حالیہ سرگرمیوں سے جڑی ہوئی ایک اور اچھی خبر یہ بھی سامنے آئی ہے کہ پارٹی کو دوبارہ سرگرم کرنے والوں کی اکثریت ان کے نسبتاً نوجوان کارکنان کی ہے جو ڈاکٹر نجیب کی زندگی میں طالب علموں کی سیاست کی رہنمائی کرتے تھے اور ان کی شناخت پارٹی کی دوسرے یا تیسرے درجے کے قائدین کی تھی۔ PDPA کے صفِ اول کے جو سینئر قائدین تھے وہ اس اجلاس سے غیر حاضر تھے۔ اجلاس میں ایسے سینئر لوگ بھی موجود نہیں تھے جو اس سے پہلے بھی پارٹی کی نئے سرے سے تنظیم کاری کرنے کی کوششوں میں کوشاں رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پرانے اور ناکام تجربات دوبارہ نہیں دہرائے جائیں گے۔ وہ مایوسی جو پرانے لوگوں کو ہوئی تھی کہ پارٹی دوبارہ کھڑی نہیں ہوسکتی، وہ بھی نہ رہی گی کیونکہ اس مرتبہ جو پارٹی کو سرگرم کرنے کی نیت سے آگے آئے ہیں انہوں نے پہلے ایسی کوئی کوشش کی ہی نہیں ہے جو ان کو مایوس کرے کہ اب وہ کام نہیں ہوگا۔

1990 میں جب حزبِ وطن کی آخری کانگریس ہوئی تھی تب پارٹی کی کل ممبرشپ 1 لاکھ 85 ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ جن میں سے اکثر لوگوں نے تو بعد میں سیاست ہی کو خیر باد کہہ دیا۔ اس لیے چنانچہ یہ اچھی بات ہے کہ حالیہ اجلاسوں میں نوجوان کارکنان، جن میں لڑکیاں بھی کثیر تعداد میں شامل ہیں، سرگرم نظر آتی ہیں لیکن بہرحال مایوس ہوکر کونے میں بیٹھے ہوئے سابق سیاسی کارکنان خواہ نئے لوگوں کو سرخ سیاست کی طرف مائل کرنا اور نئے سرے سے تنظیم کاری کرنا ایک بہت ہی مشکل ہدف ہوگا۔

1992 میں جب PDPA پر پابندی عائد کی گئی تھی تو پارٹی کے اکثر قائدین ملک سے باہر جا چکے تھے. ان میں سے کچھ تو بیرونِ ملک سے بھی سیاست کرتے رہے۔ لیکن ان کی اکثریت نے سیاست کرنا چھوڑ دی۔ بعدازاں 2016 میں جب افغانستان کے انتخابات ہوئے تو کم از کم 16 سیاسی پارٹیوں میں سابق PDPA کے کارکن شامل تھے۔ اسی طرح افغانستان کی جو چھوٹی پارٹیاں ہیں ان میں زیادہ تر قائدین سابق خلق اور پرچم کے حلقوں سے ہی تعلق رکھنے والے ہیں۔ لہٰذا نظر یہ آرہا ہے کہ افغانستان میں کمیونسٹ کامریڈز آگے بڑھ سکتے ہیں۔ وقت اور حالات ان کو آپس میں اتحاد قائم کرنے پر مجبور کررہے ہیں تاکہ اپنی مادرِ وطن کو سامراجی قبضے اور جارحیت سے آزاد کرائیں۔ کتنی ہی دہائیوں سے ظلم و بربریت کے میدان بنے ہوئے افغانستان کی سرزمین پھر سے چین کا سانس لے سکے اور عوام خصوصاً محنت کش عوام کو سکون نصیب ہو۔ ملک قرونِ وسطیٰ کے سیاہ قوانین اور رجعتی رسم و رواج اور پسماندگی سے جان چھڑا سکے۔☆

چین اور چینی کمیونسٹ پارٹی سے متعلق چند سوالات

صباح الدین صباء

آج دنیا بھر میں خاص طور پر ہمارے ملک میں بائیں بازو کے حلقے میں چین کا سوال انتہائی حساس اہمیت کا حامل ہے یہ بھی درست ہے کہ چین میں منڈی کی معیشت پر زور اصلاحات اور کھلے پن کی پالیسیوں پر عمل درآمد نے اس سوال کو زیادہ متعلق بنادیا ہے تاہم اس سوال کا جائزہ لیتے ہوئے خود کو مغرب خاص طور سے امریکی سامراج کے چین مخالف پروپگنڈے سے الگ رکھنا ضروری ہے چینی کمیونسٹ پارٹی اور اس کی حکومت کی مجموعی کارکردگی کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

چینی کمیونسٹ پارٹی نے پولینڈ سے شروع ہونے والے ردانقلاب کی لہر کو روکنے، اپنے وجود اور پرولتاری آمریت کو برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ عالمی سرمایہ دارانہ نظام اور امریکی سامراج کی بالادستی کو واپس پھیرنے کے عمل میں قابل ذکر کامیابی حاصل کی۔ اس کے ساتھ ہی چین اور چینی کمیونسٹ پارٹی کے خلاف سامراج کے پروپگنڈے میں جارحانہ پن بڑھتا جارہا ہے روایتی دشمنوں کے علاوہ لبرل اور ترقی پسندوں کی صفوں میں بھی ایسے عناصر ہیں جو چین اور چینی کمیونسٹ پارٹی کے بارے میں ارادی اور غیر ارادی طور پر غلط فہمیوں کو فروغ دے رہے

ہیں۔

چینی کمیونسٹ پارٹی کیا اور کیوں کر کرتی ہے؟

چینی کمیونسٹ پارٹی کے تمام اقدامات کے پیچھے اصل قوت محرک سوشلزم کے پرائمری اور ترقی یافتہ مراحل کی تفہیم ہے۔ پرائمری سطح پسماندہ پیداواری قوتوں سے عبارت ہے جو بجائے خود ترقی یافتہ سماجی رشتوں کی راہ میں رکاوٹ ہوتی ہیں ترقی یافتہ مرحلہ اعلیٰ ترقی یافتہ پیداواری قوتوں کی علامت ہے۔

مارکس نے کہا تھا کہ عوام کو اس وقت تک آزادی نہیں مل سکتی جب تک وہ میعاری خوراک، رہائش اور کپڑے کے حصول میں کامیاب نہیں ہوتے۔ آزادی ایک تاریخی عمل ہے نہ کہ ذہنی اور یہ تاریخی حالات سے حاصل کی جاتی ہے۔ صنعت تجارت، زراعت وغیرہ کی ترقی کی صورت میں۔

قصہ مختصر۔ سوشلزم کا مقصد معاشرہ کو کمیونزم کی طرف بڑھانا ہے اور اس کے لیے ترقی پیشگی شرائط میں سے ایک ترقی یافتہ مادی۔ فنی اساس کا حصول ہے یہ معاملہ چین جیسے ملکوں کے لیے زیادہ اہم ہو جاتا ہے جنہیں سامراجی لوٹ کھسوٹ نے بدترین پسماندگی میں جکڑے رکھا تھا۔

اقتصادی ترقی کے حوالے سے چینی کمیونسٹ پارٹی کا یہ رویہ کوئی نئی بات نہیں۔ چینی سوشلزم میں اشیائے صرف کے تعلق سے پوچھے گئے ایک سوال پر ماؤ نے جواب دیا تھا کہ چین سوشلزم کے ابتدائی مرحلے میں ہے۔ اسٹالن نے سوویت یونین میں سوشلزم کے اقتصادی مسائل پر سیر حاصل گفتگو کی ہے خود لینن نے بھی اس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے لینن کا کہنا تھا کہ ہم اب چھوٹے پیداواری عمل سے براہ راست سوشلزم میں داخل ہونے کے اہل نہیں

"We are yet unable to pass directly from production to Socialism" ہم چھوٹے درجے کے پیداواری عمل سے براہ راست سوشلزم میں داخل نہیں ہو سکتے محدود سرمایہ داری چھوٹے درجے کے پیداواری عمل کے تسلسل کے طور پر ناقابل گریز ہے۔ لہذا ہمیں لازمی طور پر سرمایہ داری سے استفادہ کرنا چاہیے۔ (خاص طور سے اسے ریاستی سرمایہ داری کی راہ پر ڈالتے ہوئے) چھوٹے پیداواری عمل اور سوشلزم کے درمیان رابطہ کے طور پر ایک ذریعہ ایک راستہ اور ایک طریقہ کار کے طور پر جس سے پیداواری قوتوں کو ترقی حاصل ہو۔''

(منتخبات لینن ''شمارہ ۳۲۰ صفحہ ۳۵۰)

اسی طرح لینن نے اپنی معروف نئی اقتصادی پالیسی (NEP) کی وضاحت کرتے ہوئے کیا کہا ''اس کا مطلب ہے ایک مخصوص حد تک ہم سرمایہ داری کو بحال کر رہے ہیں ہم یہ سب کچھ کھلے عام کر رہے ہیں۔ یہ ریاستی سرمایہ داری ہے لیکن ایک ایسے معاشرے میں جہاں سرمائے کی حاکمیت قائم ہو ریاستی سرمایہ داری ہوتی ہے جبکہ ایک پرولتاری ریاست میں سرمایہ داری مختلف ہوتی ہے ہم مائنز جنگلات اور آئل فیلڈز بیرونی سرمایہ کاروں کو لیز پر دیں گے اور اس کے بدلے میں تیار مال اور مشینری حاصل کریں گے اور اس طرح خود اپنی صنعت بحال کریں گے اور اسے ترقی دیں گے''

(منتخبات لینن ''شمارہ ۳۲۰ صفحہ ۴۹۱)

کیا چینی کمیونسٹ پارٹی کی حکمت عملی کامیاب ہے؟

چینی کمیونسٹ پارٹی کی ترقیاتی حکمت عملی کیا ہے اس کو سمجھنے کے لیے چین کے صدر اور چینی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکریٹری ژی جنگ پنگ کے اس اعلان پر نظر رکھنا لازم ہے:

"Economic Development is party`s Central Task and idealogical progress is one of his top priorties" اقتصادی ترقی پارٹی کا مرکزی ٹاسک ہے اور نظریاتی ترقی اس کی اولین ترجیحات میں سے ایک ہے۔

جہاں تک اقتصادی ترقی کا تعلق ہے چین ۲۰۱۳ء سے ۲۰۱۶ء کے دوران جی ڈی پی 7.2 فیصد سالانہ کی شرح سے ترقی کرتی رہی یہ شرح اوسط عالمی شرح کی ترقی 2.6 فیصد اور دوسری ترقی پذیر معیشتوں کی شرح چار فیصد کے مقابل میں رہی۔

۲۰۱۳ء۔۲۰۱۶ء کے دوران بین الاقوامی ترقی میں چین کا حصہ تیس فیصد رہا جو امریکہ اور جاپان کے مجموعی حصے سے زیادہ

ہے۔

۲۰۱۳ء۔۲۰۱۶ء کے دوران چین نے ہر سال شہری علاقوں میں ۱۳ ملین نئی ملازمیں پیدا کیں۔

عالمی معیشت میں زوال پذیری کے رجحان کے باوجود چین میں ریاستی زیر انتظام ادارے مستحکم تر ہوتے رہے ہیں۔ اور ۲۰۱۶ کے اختتام پر SoEs کے کل اثاثے 7.62 ٹریلین امریکی ڈالر تک پہنچ گئے جو ۲۰۱۱ء کے مقابلے میں ۸۰ فیصد زیادہ ہیں۔

عوامی جمہوریہ چین میں ہر سال ایک ملین لوگوں کو غربت کی سطح سے اوپر اٹھایا جا رہا ہے۔

چین میں صنعتی مزدوروں کی تنخواہوں میں ہر سال گیارہ فیصد اضافہ ہو رہا ہے اور یہ ایک ایسی دنیا میں ہو رہا ہے جہاں تقریباً تمام ممالک میں تنخواہیں ایک جگہ رکی ہوئی ہیں۔

جی ڈی پی کی فی کس شرح ۱۹۸۰ء میں ۳۱۰ ڈالر تھی۔ ۲۰۱۷ء میں ۱۶۶۷۶ ڈالر ہو گئی اور ۲۰۳۰ میں یہ 30000 ڈالر ہو جائے گی۔

چینی خصوصیات کی حامل سوشلزم کا اولین ہدف ترقی ہے یہ بات بالکل واضح ہے کہ چینی خصوصیات کی حامل سوشلزم ترقیاتی اہداف کے حصول میں مکمل کامیاب ہے۔

اسٹالن کی قیادت میں سابق سوویت یونین میں ترقی کی غیر معمولی رفتار اور آج کے چین میں ترقیاتی اہداف کے حصول کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ ترقی کے حوالے سے اسٹالن اور ژی جن پنگ کے ادوار انسانی تاریخ کے زرین ترین ادوار ہیں۔

کیا عوامی جمہوریہ چین محنت کش طبقے کی آمریت ہے؟

چینی کمیونسٹ پارٹی نے اقتصادی ترقی کو اپنا مرکزی ٹاسک قرار دیتے ہوئے نظریاتی ترقی اور استحکام کو ذرہ برابر نظر انداز نہیں کیا یہی وجہ ہے کہ مغربی ابلاغ ژی چن پنگ کے اقدامات کو چھوٹا ثقافتی انقلاب یا Mini Cultural Revolution) سے تعبیر کرتے ہیں۔

ژی چن نے صدر مملکت کا عہدہ سنبھالتے ہی منڈی کی بے مہار قوتوں سے پہنچنے والے نقصانات کا ازالہ کرنے کے لیے معروف عوامی لائن مہم منظم کی جو ایک سال سے زائد عرصہ جاری رہی اور جس نے پارٹی حکام اور عوام کے درمیان پیدا ہونے والی خلیج کو کم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

کثیر القومی کمپنیوں کو چین کے قوانین کا پابند بنایا جا رہا ہے اور قوانین کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف بھی کارروائیاں کی جا رہی ہیں۔ حال میں چپ بنانے والی سب سے بڑی امریکن کمپنی کوالکوم اور برطانیہ کی دوا ساز کمپنی گلیکسوز کے خلاف مقدمات اور جرمانے اس کی مثال ہیں۔

مغربی بورژوا کلچر کے اثرات سے نمٹنے اور تعلیمی نظام کی درستی پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں تدریسی عمل کی نگرانی کے نظام کی بحالی چینی کمیونسٹ پارٹی کی موجودہ قیادت کا اہم کارنامہ ہے "The latest diredtive document No 30 demands cleansing western inspired liberal ideas from universities and other cultural institutions."

تمام سرکاری اہل کاروں کے لیے مارکسزم کا کورس مکمل کرنا لازم قرار دیا گیا ہے۔

ذرائع ابلاغ کے کارکنوں تمام صحافیوں اور صحافت کے طالب علموں کے لیے بھی مارکزم کی تعلیم حاصل کرنا لازم ہے۔

اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے کہ آیا عوامی جمہوریہ چین پرولتاری کی آمریت ہے؟ اس امر کو جاننا ضروری ہے کہ چین سمیت کوئی بھی ریاست یا تو ایک طبقے کی آمریت ہے یا دوسرے کی۔ سرمایہ دار محنت کش طبقے میں سے اگر ایک کی آمریت نہیں ہے تو دوسرے کی ضرور ہو گی اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ آیا بورژوا آمریت میں:

☆.....تمام سرکاری اہل کاروں کے لیے مارکسزم کا کورس مکمل کرنا لازمی قرار دیا جاتا ہے؟

☆..... تمام صحافیوں اور صحافت کے طالب علموں کو ماکسزم کی تعلیم حاصل کرنا لازمی قرار دیا جاتا ہے؟

☆.....کالجوں میں نظریاتی تعلیم کو فروغ دیا جاتا ہے اور ۲۶۰۰ یونیورسٹیوں میں فکری ماؤزے تنگ کی کلاسیں متعارف کرائی جاتی ہیں۔

☆.....کیا ایک بورژوا آمریت سرمایہ دارانہ نظام کے بحران کے باعث نیولبرل ازم کے تحت محنت کشوں کی مراعات میں کٹوتی کی عالم گیر مہم کے دوران جامع سماجی پروگراموں پر عمل درآمد کرتی ہے۔

مختصر یہ کی سی پی سی نے مارکسزم لینن ازم سے انحراف نہیں کیا اور کامیابی کے ساتھ سوشلسٹ تعمیر کے کام کو آگے بڑھایا ہے عوامی جمہوریہ چین پرولتاریہ کی آمریت ہے اور چینی معیشت بنیادی طور پر سوشلسٹ ریاستی منصوبہ بندی کے تحت کام کر رہی ہے علاوہ ازیں سی پی سی ترقی یافتہ سوشلزم کے حصول کے لیے بہترین پوزیشن کی حامل ہے۔ تاہم اس کا یہ مطلب نکالنا درست نہیں ہوگا کہ سب کچھ ٹھیک ہو چکا۔ چین میں بورژوا طبقہ نہ صرف موجود بلکہ چینی کمیونسٹ پارٹی کا تختہ الٹنے کے لیے ہر وقت سرگرم عمل ہے اور متعلقین کو ہر وقت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

بعض عناصر کی یہ سوچ کہ چین میں ۱۹۷۶ تک سب کچھ عین انقلابی اور سوشلسٹ تھا اور ۱۹۷۶ء میں ماؤ کے انتقال کے بعد سب کچھ اچانک ختم ہو گیا کسی طور سائنسی یا منطقی قرار نہیں دی جا سکتی۔

چینی کمیونسٹ پارٹی کی تاریخ بائیں اور دائیں بازو کے رجحانات میں مسلسل کشمکش اور ستیزہ کاری کی تاریخ ہے تاہم چیئرمین ماؤ سمیت تمام رہنماؤں کی اس بات پر اتفاق رہا ہے کہ ایک ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ معاشرے کے ترویدر کی بلوغت کے بغیر سوشلزم کی جانب پیش قدمی ممکن نہیں۔ چینی کمیونسٹ پارٹی نے پیداواری قوتوں کو ترقی دینے کے لیے اصلاحات ضرور کی ہیں اور وقتاً فوقتاً ان اثرات کا بھی جائزہ لیا ہے اور ان میں ضرورت کے مطابق ردوبدل بھی کیا ہے جہاں تک چینی ریاست کی نوعیت کا تعلق ہے تو چین آج بھی عوامی جمہوریہ ہے وہاں چینی کمیونسٹ پارٹی حکمران ہے اور ریاست کی نظری اساس مارکسزم، لینن ازم اور فکر ماؤزے تنگ ہے۔ چین کی حکمران جماعت نے پارٹی کے قیام کی سو سال بعد چین کو ہر طرح سے خوشحال معاشرہ بنانے اور عوامی جمہوریہ کے قیام کے سو سال بعد ایک ترقی یافتہ سوشلسٹ معاشرے کے قیام کو اپنا ہدف بنایا ہے اور وہ شاندار کامیابیوں کے ساتھ چین کی ترقی اور سوشلزم کی تعمیر کی راہ میں آگے بڑھ رہی ہے۔

ماؤ اور مابعد ماؤ دور میں کیا فرق ہے؟

بعض بورژوا تجزیہ نگار چین کی ترقی کا اعتراف کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ چین نے ترقی تو کی ہے لیکن یہ ترقی منڈی کی اصلاحات اور بیرونی سرمایہ کاری کی مرہون منت ہے۔ یہ درست ہے کہ حالیہ چند دہائیوں میں غیر معمولی ترقی کا عمل دیکھنے میں آیا ہے لیکن اس کی بنیاد پہلے کیے گئے کام پر ہی ہے۔ 1950-60,70 کی دہائیوں میں ہونے والی بنیادی صنعت کاری کے بغیر کھلے پن کی پالیسی تباہ کن ثابت ہو سکتی تھی اور چین کو نیم نوآبادیاتی مرحلے میں واپس جانا پڑ سکتا تھا۔ اس کی معیشت مکمل طور پر سامراجی قوتوں کے تسلط میں جا سکتی تھی جیسا کہ پہلے تھی لیکن ایسا نہیں ہوا خاص طور پر اس لیے کہ اس کھلے پن کی بنیاد عوامی جمہوریہ کی اولین دہائیوں میں حاصل کردہ کامیابیوں پر رکھی گئی تھی۔

۱۹۸۱ء میں چینی کمیونسٹ پارٹی کی قومی کانگریس میں عوامی جمہوریہ چین کے قیام سے لے کر اب تک ہماری پارٹی کے بعض اہم معاملات پر منظور کردہ قرارداد اسے اس طرح بیان کرتی ہے۔

''سوشلسٹ نظام کا قیام چینی تاریخ میں عظیم ترین اور سب سے نمایاں تبدیلی ہے اور یہی ملک کے مستقبل کی تعمیر و ترقی کی اساس مہیا کرتی ہے'' حقیقت یہ ہے کہ ماؤ کے دور اور آج کے چین کے درمیان کوئی دیوار چین نہیں ہے۔ حکمت عملی اور پالیسیوں میں وقت کے مطابق فرق ضرور ہے لیکن مجموعی مقاصد اور سمت ایک ہی ہیں اور یہ مقصد ایک مضبوط و جدید خوشحال تعلیم یافتہ مہذب سوشلسٹ چین کی تعمیر ہے۔ آج بھی چینی کمیونسٹ پارٹی کا اہم مقصد اپنا دفاع اپنے عوام کا معیار زندگی بہتر بنانا اور دنیا کو ایک بہتر جگہ بنانے میں کردار ادا کرنا ہے۔

غیر روایتی انداز فکر کیا ہے؟

نیلسن منڈیلا نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ ایڈگر سنو کی معروف کتاب ریڈ اسٹار اوور چائنہ کا مطالعہ کرتے ہوئے انہوں نے محسوس کیا کہ یہ ماؤ کا عزم مصمم اور ان کا غیر روایتی انداز فکر تھا جس نے انہیں فتح مند کیا۔

ماؤ کی تعلیمات میں غیر روایتی انداز فکر کا یہ پہلو غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ ہر چند کہ بہت سے بزعم خود ماؤ نواز آج عقیدہ پرستی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ماؤ کی تحریریں انقلاب کا کوئی بلیو پرنٹ پیش کرتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ماؤ خود ایسے تیار نسخوں کا صریح مخالف تھا وہ اس سے قطعی واضح تھا کہ انقلاب کا کوئی طے شدہ سادہ فارمولہ نہیں ہوتا اس کی تحریروں میں بار بار مسائل کا تخلیقی اور سنجیدہ تجزیہ کرنے پر زور دیا گیا ہے۔

''کتاب پرستی کی مخالف کرو'' نامی پمفلٹ ماؤ کے غیر روایتی انداز فکر کا بہترین اظہار ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ''ہمیں کتابوں کی ضرورت ہے لیکن ہمیں کتابوں کی پرستش سے گریز کرنا چاہیے''

لہذا آج ماؤ کی پیروی کرنے کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ صرف وہ کیا جائے جو ماؤ نے کیا ہے بلکہ اس کی دلیری' دانشمندی' سچائی اور سب سے بڑھ کر اس کے غیر روایتی انداز فکر سے استفادہ کرنے کی ضرورت ہے۔

چینی انقلاب کے بقیہ دنیا پر اثرات کیا ہیں؟

چین کے عوامی جمہوریہ انقلاب اور ماؤ زے تنگ کی تعلیمات نے دنیا کی تعمیر اور خاص طور سے ایشیا' افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ملکوں پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

ویت نام' لاؤس' کمبوڈیا' فلسطین' زمبابوے' الجزائر' کوریا اور تنزانیہ میں قومی آزادی کی تحریکوں میں چینی تعاون اور تاریخی کردار ناقابل فراموش ہے۔ یہ بات ذہن نشین کرنے کی ہے کہ چین کا انقلابی ماڈل ان تمام ملکوں کے لیے حوصلہ افزائی کا باعث بنا جو نوآبادیاتی نظام اور پسماندگی میں چین سے ملتی جلتی صورت حال کے حامل تھے یا ہیں۔ اس میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں کہ ماؤ اور چینی انقلاب نے مارکسزم کو یورپ کے صنعتی مزدوروں سے دنیا بھر کے مظلوم اور محکوم عوام تک وسعت دینے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

آج جنوب کے وہ ممالک جو اپنے عوام کی زندگی بہتر بنانے کے لیے کوشاں ہیں وہ چین سے حاصل ہونے والے گراں قدر تعاون اور مدد کے معترف ہیں۔ گزشتہ دہائی کے دوران وینزویلا کا ابھار چینی تعاون کے بغیر ممکن نہ تھا کیوبا' جنوبی افریقہ' بولیویا' زمبابوے' انگولا' نیپال اور متعدد ترقی پذیر ملکوں کے لیے ہی چینی امداد نمایاں اہمیت کا حامل ہے

تیسری دنیا کے ملکوں میں سامراج سے گلوخلاصی حاصل کرنے کی موجودہ لہر اور بیداری بہت حد تک چین' چینی کمیونسٹ پارٹی ماؤ اور اس کے ساتھیوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

کیا چین ایک سامراجی قوت ہے؟

ایک بورژوا آمریت ہی سامراج کی شکل اختیار کرتی ہے اور اگر چین ایک بورژوا آمریت نہیں تو یہ سامراج کی شکل بھی اختیار نہیں کر سکتی۔

☆.....عالمی بینک کی ایک رپورٹ کے مطابق چین تیزی سے ترقی کرتا ملک ہے اس نے کم آمدن سے درمیانہ آمدن والے ملک کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور درمیانہ سے اعلیٰ آمدن والی حیثیت کے لیے کوشاں ہے۔

☆.....رپورٹ کے مطابق چین ابھی بھی ایک ترقی پذیر ملک ہے اب آپ خود فیصلہ کریں کہ ایک ملک بیک وقت ترقی پذیر بھی ہو اور سامراج بھی کیا یہ ممکن ہے۔

☆.....بعض عناصر زچ ہو کر یہ کہتے ہیں کہ ابھی تو چین سامراج نہیں ہے لیکن انہیں خدشہ ہے کہ مستقبل میں وہ سامراجی شکل اختیار کر لے گا اب یہ بات انہیں کون بتائے کہ سیاسی حکمت عملی خدشات اور اندیشوں کے نہیں موجود ٹھوس حقائق کے مطابق تیار کی جاتی ہے۔

☆.....اہم ترقی کرتی معاشی و سیاسی قوت کے طور پر چین کے بین الاقوامی کردار کا جائزہ لینے کے لیے چین کی خارجہ پالیسی اور چینی قیادت کے بین الاقوامی وژن کو دیکھنا بھی ضروری ہے۔

☆.....چینی صدر اور چینی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکریٹری ژن جن پنگ نے چین کی ترقی کے ساتھ بنی نوع انسانی کے مشترکہ مستقبل کی تعمیر کا نیا تصور متعارف کرایا ہے۔

☆.....وہ تواتر سے اپنے اس بین الاقوامی وژن کا نہ صرف ذکر

کرتے رہے ہیں بلکہ اقتصادی انیشی ایٹو (Initiaive) اور سیاسی تعلقات پر اس کے اثرات بھی نمایاں ہیں' بیلٹ اور اینڈ روڈ انی اشی ایٹواس کا بہترین مظہر ہے۔

☆.....حال ہی میں چینی خارجہ پالیسی پر دوروزہ کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے ژی جن پنگ نے ایک بار پھر اعلان کیا ہے کہ چینی کمیونسٹ پارٹی کی حکومت چین کی ترقی خودمختاری کے دفاع کے ساتھ ساتھ علاقائی امن وسلامتی کو محفوظ بنانے' عالمی نظام میں بہتری لانے اور بنی نوع انسان کے مشترکہ مستقبل کی تعمیر کے لیے کام کرتی رہے گی۔

☆.....آج بین الاقوامی سطح پر جو ترقی پذیر ممالک اپنے عوام کی حالت بدلنے کے لیے کام کررہے ہیں وہ چین کے گراں قدر امداد اور تعاون کے معترف ہیں۔ وینزویلا کی حکومت جس کامیابی سے سامراجی سازشوں اور یلغار کا مقابلہ کررہی ہے وہ چین کے مثالی تعاون کے بغیر شاید ممکن ہی نہ ہوتا۔ اس کے علاوہ کیوبا' جنوبی افریقہ' بولیویا' زمبابوے' نکاراگوا' شمالی کوریا' لاؤس اور متعدد دیگر ترقی پذیر ملکوں کے لیے چینی امداد کلیدی اہمیت کی حامل ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ڈینگ کی قیادت میں چین میں منڈی کی معیشت کھلے پن اور اصلاحات پر بہت زیادہ زور دیا گیا جس کے نتیجے میں دائیں بازو کی ترمیم پسندی کو فروغ حاصل ہوا جو سابق چینی صدر جیانگ ژیمن کے دور میں اس حد تک بڑھ گئی کہ انہوں نے سرمایہ داروں کو بھی پارٹی میں شمولیت کی دعوت دے دی تاہم یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ چینی کمیونسٹ پارٹی کے اندر مزاحمت اسی دور میں شروع ہوگئی تھی اس وقت سے آج تک چین میں کثیر القومی سرمایہ اور مقامی سرمایہ کے درمیان تضاد نہ صرف موجود ہے بلکہ معاشی اور سیاسی میدان میں ان کے ٹکراؤ کے مظاہر نظر آتے ہین تاہم آج بھی نجی سرمایہ کے مقابلے میں ریاستی سرمایہ کی بالادستی' سامراج پر قومی مفاد کی برتری اور ترمیم پسندی کے بجائے سوشلسٹ اصولوں کی سربلندی غالب رجحانات ہیں۔

☆.....☆

قومی سوال کا تاریخی تناظر

محمد سعید

''عوامی جمہوریت'' کے گزشتہ شمارے میں شاہ محمد مری نے ''رسالہ عوامی جمہوریت کی پچاسویں سالگرہ'' زیرعنوان مضمون تحریر کیا ہے جس میں ماضی بعید میں سی آر اسلم کے ایک آرٹیکل کا حوالہ دیا گیا ہے جو انہوں نے قومی مسئلے پر لکھا تھا۔ پاکستان وفاق کی مختلف اکائیوں کا تشکیل کردہ ہے یہاں قومی مسئلہ ہمیشہ ایک سلگتا ہوا سوال رہا ہے۔ اس کی حساسیت تقاضا کرتی ہے کہ اس پر دھیان دیا جائے۔ میں نے اسی حوالے سے قومی سوال کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اگر میرے سمجھنے میں کوئی الجھاؤ ہوا تو امید کرتا ہوں ساتھی زیر بحث مسئلے پر اپنی رائے کا اظہار کریں گے۔

نیشنل ازم کی بہت ساری تعریفیں کی جاتی ہیں کسی ایک پر سب کا اتفاق ممکن نہیں البتہ نیشنل ازم کے رجحان کی تفہیم کے لیے کہا جاسکتا ہے کہ ایک ایسی کیفیت ہے جس کے تحت ایک فرد خود کو ایک گروہ اور اس کی حیثیت سے وابستہ کرلیتا ہے جس گروہ کے افراد ایک علاقے میں رہتے ہوں جس کی ایک زبان ہو ان کی ثقافت میں یکساں پہلو وافر مقدار میں پائے جاتے ہوں وہ مشترکہ ماضی کی حامل ہو اور ان میں یکساں اور مشترک ہونے کا احساس اور شعور بھی پایا جاتا ہو یعنی نیشنل ازم کے اندر ایک صلاحیت موجود ہے کہ انسان کو اپنی ذات سے باہر وابستگی کا اجتماعی محور فراہم کرے۔ جوزف اسٹالن نے اسی مفہوم میں کہا ہے کہ قوم تاریخی ارتقاء کے لیے جنم لینے والی کمیونٹی ہے جس کی اپنی زبان' اپنا علاقہ' اپنی معاشی زندگی اور نفسیاتی عادتیں ہوتی ہیں جو ان کی ثقافت میں اظہار پاتی ہیں۔

حقیقت تغیر پذیر مظہر ہے اور تعریف اپنی جگہ جامد اس لیے سماجی حقائق اور احوال مختلف نظری طریقوں سے بیان کیے جاسکتے ہیں۔ نظری تشریح بنیادی طور

پر کسی سماجی حقیقت کی پیداوار اور اس کی حاصل ہوتی ہے۔نظری تشریحات اور نظری سانچے حقیقت کو جنم نہیں دیتے۔۔کسی گنجلک مسئلے کو ایک ہی طریقے سے دیکھے جانا اس کے دوسرے عناصر پر غور نہ کرنا' جدلیات کا بچگانہ اور غلط استعمال ہے فلسفے کی تاریخ میں اسے فسطائیت سے تعبیر کیا جاتا ہے کسی سوال کرنے کے لیے ارتقائی عمل کو پیش نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ نیشنل ازم کو خاص تاریخی حدود کے اندر رکھ کر پرکھا جائے۔

نیشنل ازم کے غور سے پہلے ہم ماضی پر نظر ڈالتے ہیں۔

دور سیاہ جو یورپ پر ایک ہزار سال تک مسلط رہا اس میں جو چیز قوم کہلاتی تھی وہ بنیادی طور پر عقیدے کی جمعیت Community of faith تھی جو مقدس علامتوں اور مقدس کنایوں کے گرد یکجا تھی ۔ اس وقت جاگیروں اور زمینداریوں میں بکھرے کسان اور ان پر مسلط حکمران' جاگیردار' اور بادشاہ جس ریاستی ڈھانچے کے تحت چل رہے تھے وہ مطلقاً مربوط نہیں یعنی ایک لحاظ سے منتشر تھا۔ جاگیردارانہ طرز پیداوار کے تحت بادشاہ ہی حکمران ہو سکتے تھے بادشاہ کو خدا کا فرستادہ سمجھا جاتا تھا۔ بادشاہی کی ساکھ کا زیادہ سے زیادہ دار و مدار مذہبی عقائد پر تھا۔ جاگیرداری سماج میں پیداوار کا جو معیار تھا وہ جس حد تک بڑھا ہوا تھا اس کی پسماندگی میں مذہبی اور مابعد الطبعیاتی عقائد کو جو سماجی بنیاد فراہم ہو سکتی تھی وہ اس سے ہم آہنگ تھا۔سماجی بنیاد جس کی اساس مذہب پر تھی کئی صدیوں تک یورپ پر مسلط رہا۔

بڑے تکلیف دہ عمل میں کئی صدیوں میں حقیقی خود آگاہی اور قومی شعور پیدا ہوا یہ عمل سرمایہ داری' پیسے کی معیشت او رقومی منڈی کے اتھ متوازی طور پر چلتا رہا یہ دو چار دن کی بات نہیں اس عمل کو پختہ ہونے میں تین صدیاں لگیں۔

جاگیرداری کی سماجی بنیاد کو توڑنا پہلی ترجیح تھا۔ برطانیہ میں کرامویل کی سیاسی بغاوت اور مارٹن لوتھر کی یورپ میں مذہبی بغاوت نے جاگیر دارانہ بادشاہت کی سماجی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔قومی منڈی کی ضرورتوں نے چھوٹی چھوٹی شہری ریاستوں کو توڑ دیا جس کا اپنا ٹیکس کا نظام تھا ۔ناپ تول کے اپنے معیاری پیمانے تھے اس مقامی نظام کو توڑنا اس کی ضرورت تھی۔ پہلے پہل یورپ میں بتدریج قومی اکائیاں وجود میں آئیں۔کسان جنگوں اور بادشاہوں کی فتوحات کے سبب جاگیر دار اپنے خود ساختہ حکومتی دائروں سے باہر نکلنے پر مجبور ہو گئے اور انہوں نے مل کر ایک مرکزی بادشاہانہ حکومت قائم کی اس نے علاقائیت اور مقامی بنیاد پر مبنی سماج اور سیاست کو ختم کر کے مختلف فرقوں' ذاتوں' قومیتوں' جاگیروں اور راجدھانیوں کو ایک ریاست میں جوڑ کر اور ان بکھری ہوئی آبادیوں کو یکجا کر کے جدید نظام کی تشکیل کی گئی۔نئی منڈی' تجارت کے فروغ' ذرائع ابلاغ اور ذرائع آمد و رفت کی ترقی نے ان فاصلوں کو دور کیا جو اس تشکیل میں رکاوٹ تھے یہ صنعتی انقلاب ہی تھا جس نے ماضی کے سماجی رشتوں کی جگہ سرمایہ داری نظام کی آبیاری کی۔

دنیا بھر میں جاگیرداری پر سرمایہ داری کی فیصلہ کن فتح کے دور کا رشتہ قومی تحریکوں سے چولی دامن کا رہا ہے۔ان تحریکوں کی اقتصادی بنیاد یہ حقیقت ہے کہ جنس تبادلہ کی پیداوار کی مکمل فتح کے لیے لازمی ہے کہ بورژوا طبقہ اندرونی منڈی پر پوری طرح چھاپہ مارے اس کے لیے ضروری ہے کہ سیاسی طور پر متحدہ علاقے ہوں جس کی آبادی ایک زبان بولتی ہو۔زبان کی نشو ونما میں رکاوٹیں ہٹا دی جائیں۔ انسانوں کا میل جول کا ذریعہ زبان ہے۔صحیح معنوں میں آزاد اور وسیع تجارتی میل جول کے لیے جو جدید سرمایہ داری کے لیے موزوں ہو' تمام الگ الگ طبقوں میں' آبادی کی آزاد اور وسیع گروہ بندی کے لیے' اور آخر میں بازار اور چھوٹے بڑے حاکموں میں' خریدار اور فروخت کنندہ میں گہرا تعلق قائم کرنے کے لیے' زبان کا اتحاد اور اس کی بے روک ترقی اہم ترین شرطوں میں سے ہے۔

اقتصادی لین دین کے تقاضے ہمیشہ ایک ریاست میں آباد قومیتوں کو اکثریت کی زبان سیکھنے پر مجبور کرتے ہیں جیسے جیسے لین دین کے لیے سب سے زیادہ آسان تھی۔

کچھ مورخین ازمنۂ وسطیٰ کا اختتام اور جدید دور کا آغاز ۱۴۵۳ء عیسوی قرار دیتے ہیں اس کے پس پردہ چھاپے خانے سے زیادہ موثر کوئی قوت نہیں۔لاطینی علمی زبان تھی چھاپے خانے کی ایجاد مقامی زبانوں کو فروغ دینے میں سب سے زیادہ رول ادا کیا۔لاطینی زبان کی عالموں سے چھٹکارا ملا جن کی مذہب پر' معاشرہ پر اجارہ داری تھی۔ جب مقامی زبانیں طباعی زبانیں بن گئیں تو ان زبانوں کو

استعمال کرنے والوں میں ایک ایسی کمیونٹی کیشن وجود میں آیا جو ان کے درمیان ماضی کے رابطوں سے زیادہ تھا۔ چھاپے خانے کی وجہ سے شائع شدہ زبانوں میں لٹریچر پھیلا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب تک جو مختلف لہجے بولے جاتے تھے اسی طباعت کے ذریعے ایک دوسرے سے واقف ہوئے اسی مسلسل عمل سے ایک معیاری زبان کا ارتقاء ہوا اسی طباعی عمل نے مقامی زبانوں کو چھپائی کی منزل سے ہم آہنگ کر کے ان کے استعمال کرنے والوں کے شعور کو جلا بخشی جس سے ترقی کر کے ماضی کی تجریدی مملکت خداداد Kingdom of god سے نکل کر دنیائے حقیقت شعار (سیکولر ورلڈ) میں پہنچ گئی جو قوموں کی دنیا تھی۔

مغربی براعظمی یورپ میں بورژوا جمہوری انقلاب کا عہد کم وبیش ایک خاص دور لگ بھگ ۱۷۷۹ء تا ۱۸۷۱ء تک کا احاطہ کیے ہوئے ہے جدید قومی ریاستوں کا عمل فرانسیسی انقلاب کے ساتھ آگے بڑھا اس انقلاب نے سرمایہ داری کو جلا بخشی ۔ واحد جمہوریہ اور ناقابل تقسیم کے نعروں کی گونج نے پہلی دفعہ فرانس کو ایک قوم کے طور پر متحد کیا فرانسیسی انقلاب صرف سیاسی انقلاب نہیں کیا بلکہ وہ ایک سیاسی انقلاب بھی تھا اس نے جاگیردارانہ مطلق العنانیت کا خاتمہ کر دیا جاگیرداری کی سماجی بنیاد کلیسائیت اور اس کا ریاست میں اثر ورسوخ یکسر ختم کر دیا ۔ان اقدامات نے ہر جگہ انقلابی اور ترقی پسند رجحانات کے لیے مہمیز کا کام کیا۔ جب فرانس پر نپولین کا عہد شروع ہوا تو نپولین کے دور حکومت میں بھی انقلابی پیغام ایک مسخ شدہ شکل میں فرانس یورپ کے مختلف علاقوں میں پھیلایا جاتا رہا۔ نپولین کا عہد حکومت مقدس برکت نہیں تھا ویسے بھی بندوق بردار خادمین کو کوئی پسند نہیں کرتا۔ مفتوحہ علاقوں پر بھاری ٹیکس اور جنگی تباہ کاریوں نے ناگزیر طور پر قومی آزادی کی شکل میں اپنی مخالفت پیدا کر لی۔ عموماً کہا جاتا ہے فرانسیسی انقلاب نے آزاد خیالی جان بوجھ کر پھیلائی جبکہ قوم پرستی کو غیر ارادی طور پر پیدا کیا روس کے برفیلے منجمد میدانوں میں فرانسیسی افواج کو شکست اور تباہی فرانس کے خلاف قومی بغاوت کی لہر ابھارنے کا اشارہ تھیں ناگزیر طور پر قومیں خارجی چیلنجوں کے مقابلے میں وجود میں آئیں لیکن یہ بات بھی طے ہے کہ جدید قومی ریاستوں میں اکثر ریاستیں نپولین کی خونی جنگوں کے بعد فتح مندی کی تقسیم کے نتیجے میں معرض وجود میں آئیں۔

وہ طبقہ جس کو قومی ریاست کی ضرورت تھی اس طبقے نے باقی یورپ میں بہت ساری توڑ پھوڑ کی اسی توڑ پھوڑ کے نتیجے میں مختلف بنیادوں پر نئے ممالک کا جنم ہوا۔ انگلستان، فرانس، ہالینڈ، اور امریکہ کی ریاستوں کی سرزمین پہلے سے متعین تھی بادشاہی کے رول کو ختم کر کے نئے ڈھانچے کے ساتھ انہیں قومی ریاستیں بنا دیا گیا۔ یورپی تاریخ میں ہالینڈ پہلی ریاست تھی جرمنی اسی پیٹرن پر بننے والی آخری ریاست تھی۔

حقیقتاً جدید ریاستیں ابتداً ابھرتے ہوئے تجارت پیشہ سرمایہ دار طبقے کی ریاستیں تھیں اس طبقے نے اپنے مفاد کے پیش نظر نئی ریاستوں کی سرحدیں متعین کی تاکہ اپنی اپنی ریاستوں میں ان کو اور ان کے سرمایہ کو سربلندی حاصل ہو۔ اس سرمایہ دار طبقے کو مخصوص علاقے پر اپنے تصرّف کو یقینی بنانے کے لیے اور اس علاقے میں رہنے والے شہریوں کے تعاون کے حصول کے لیے سب شہریوں کے ایک ہونے کا دعویٰ کرنا پڑا۔ قومی ریاست کے باشندوں کو اس جمیعت سازی سے کم از کم یہ فائدہ حاصل ہوا کہ اصولاً ان کو برابر کا شہری تسلیم کیا گیا ان کے شہری حقوق کا اعتراف کیا گا اور ان کو ووٹ کا حق دیا گیا۔ سرمایہ دار طبقے کو ان کی دلجوئی کے لیے بعض رعایتوں کا وعدہ کرنا پڑا سو جمہوریت نیشنل ازم کے ساتھ ہم آہنگ ہوئی اور جدید ریاستیں قومی ریاستیں قرار پائیں۔

قومی ریاستوں کی تشکیل کا اگلا مرحلہ مشرقی یورپ میں مکمل ہوا مغربی یورپ کے برعکس مشرقی یورپ کے ممالک کی سرحدیں بدلتی رہتی تھیں یہاں سیکولر مڈل کلاس نہیں تھی۔ زرعی معاشرہ تھا کسان اور زمیندار کے طبقات تھے چونکہ یہ سیاسی وسماجی اور تعلیمی لحاظ سے پسماندہ تھے اس لیے انہوں نے سیاسی نیشنل ازم کو رد کر کے کلچرل نیشنل ازم کا سہارا لیا۔

نیشنل ازم کی ایک شکل نہیں ہے ۔ یہ مختلف اشکال میں حالات کے مطابق ابھرتا ہے ۔ اس کی تبدیلی ہوتی ہوئی شکلوں کا اظہار ہر ملک کے اپنے حالات، طبقاتی مفادات اور سیاست سے ہوتا ہے ۔ دنیا کے اکثر ملکوں میں نیشنل ازم کلچر اور تاریخ کے ذریعے وجود میں آیا اس صورت میں ماضی کی تلاش اس کا اہم حصہ ہوتا ہے وہ اپنے مقاصد کے تحت ان روایات کا انتخاب کرتے ہیں جو ان کے مفاد کو پورا کر سکیں چونکہ اس نیشنل ازم کی بنیاد عقل کی بجائے جذبات پر ہوتی ہے

جو مڈل کلاس کو سب سے زیادہ انسپائر کرتا ہے ان کے جذبات کو ابھارنے کے لیے اور ذہنوں کو قومی فخر و عظمت سے متاثر کرنے کے لیے رسم و رواج اور تہواروں کو اہمیت دی جاتی ہے اپنے ماضی کی تلاش اپنے ہیروز کو نئی شناخت اسی نیشنل ازم کا حصہ ہوتا قومی سرمایہ اپنی منڈی کے لیے استعمال کرتا ہے۔

قومی منڈی کا اپنا میکانزم ہے قومی منڈی کی بنیاد پر پیداواری قوتوں کی نشو ونما بہت تیز ہوئی جدید پیداواری قوتوں نے پیداوار میں بے تحاشہ اضافہ کیا یہ پیداوار اتنی زیادہ تھی کہ ملکی و قومی منڈیاں اس کی کھپت کے لیے کم پڑ گئیں سرمایہ داری کی خصلت سرشت میں شامل ہے کہ اس کی ترقی ناہموار ہوتی ہے کچھ علاقے ترقی یافتہ اور کچھ علاقے پسماندہ رہ جاتے ہیں یہ صرف اپنی منڈی ہی تک نہیں ہوتا ملک اور براعظم پسماندگی کا شکار ہوتے ہیں اس لیے پسماندہ ممالک پر دھاوا بول کر انہیں مفتوح کر لیا گیا اگر بنظر غائر دیکھیں تو آئندہ ایک سو سال کی تاریخ پیداواری طاقتوں کی قومی ریاست کی تنگ حدود کے خلاف جدوجہد کی تاریخ ہے۔ان پسماندہ ممالک پر قبضے کی دوڑ نے بڑی پیداواری طاقتوں کے درمیان ناقابل مزاحمت رجحان کو جنم دیا انیسویں صدی کی آخری دہائیوں تک پرانے اور نئے صنعتی ممالک میں مسابقت کی دوڑ کے نتیجے میں ساری دنیا چند سرمایہ دار ممالک کے براہ راست یا بالواسطہ غلبے میں آ گئی۔۱۹۱۰ء میں دنیا کے تراسی فیصد علاقے پر برطانیہ' فرانس' اسپین' پرتگال' بلجیم' ہالینڈ' جرمنی' اٹلی' جاپان اور روس کا قبضہ تھا۔

تاریخ میں جب کوئی ملک کولونیل کا شکار ہوا اس کے نتیجے میں اس کی اپنی تہذیب کلچر اور روایات ٹوٹیں تہذیب میں جو تسلسل چلا آ رہا تھا اس میں رکاوٹیں پیدا ہوئیں۔اس کے برعکس کولونیل طاقتوں نے اپنی تہذیب اور کلچر کو مسلط کیا مفتوح علاقوں کی صنعت و حرفت برباد ہوئی۔وسائل' معدنیات اور ذرائع آمدنی کو لوٹا گیا اس لوٹ کھسوٹ نے عوام میں افلاس پیدا کیا یہی افلاس بے چینی کا باعث ہوا جبر کی تمام صورتوں کے خلاف مفتوحہ عوام نے نجات کے لیے بارہا دفعہ جدوجہد کی یہ مزاحمت بھی نیشنل ازم کے زیر اثر شروع ہوئی۔

سامراج نے اپنے استحصال کے لیے رسل و رسائل کے ذرائع پیدا کیے اپنی ضرورتوں کے لیے تعلیم کا بندوبست کیا مقامی منڈی سے جڑت جو اس مقاصد کو پورا کرتی تھی نے مڈل کلاس پیدا کی اس مڈل کلاس کے نوجوان سامراجی ممالک میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے گئے صنعتی عمل کے نتیجے میں پیدا شدہ روشن خیالی سے متاثر ہوئے نئے خیالات' نئے آئیڈیاز اور نئے تصورات کے ساتھ واپس آئے انہی نوجوانوں نے آزادی کے لیے جدید نظریات کے ساتھ حصہ لینا شروع کیا اس مزاحمتی تحریک میں مختلف طبقات اور پرتوں نے اپنی اپنی وجوہات کے ساتھ حصہ لیا یہی مزاحمتی تحریک قومی آزادی کی تحریک بنی۔

صنعتی انقلاب کا آغاز صنعتوں کے لیے خام مال کی منڈیوں پر قبضہ کی ضرورت سے شروع ہوا اس تحریک کا امام صنعتوں کا گھر برطانیہ تھا برطانیہ اور دوسرے استعماری ممالک خام مال سے اپنی صنعتوں کو چلا رہے تھے۔منڈیوں کی از سر نو تقسیم کی جنگ نے ان کو بہت کمزور کر دیا تھا' امریکہ اس جنگ میں سے فائدے میں رہا۔امریکہ نے خام مال درآمد کرنے کے بجائے مشین کو خام مال کے پاس بھیجنا شروع کر دیا جس کے باعث برطانوی نوآبادیات کی آزادی کے لیے زمین ہموار ہوئی امریکہ نے اپنی فاضل پیداوار جو مالیاتی سرمایے' صنعتی سرمائے اور مشینی سرمائے کی شکل میں تھی کو برآمد کرنے کی ضرورت کے تحت قومی خودارادیت کا نعرہ بلند کیا۔سماجی انقلاب آنے کا خوف' قومی تحریکوں کی شدت اور سامراج کی نئی صف بندی سے بہت ساری قومیں آزاد ہوئیں۔

وہ قومیں جو آزاد ہوئیں۔منڈی کی معیشت کی غلام رہیں ان ممالک میں بیشتر کثیر القومی اکائیوں والے ممالک تھے جہاں قومی خودمختاری اور صوبائی خود اختیاری جیسے مسائل نے جنم لیا۔سرمائے کے شکنجوں میں جکڑا عالمی نظام کمزور' قومی خودمختاری کو مفلوج کر دیتا ہے۔قومی خودمختاری کے اندر صوبائی خود اختیاری تو اس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔مکمل خودمختاری سے علاقائی خودمختاری کا حصہ نکالا جا سکتا ہے مگر بے مختاری سے خود اختیاری کا حصہ کیوں کر نکالا جائے؟

سرد جنگ کے بعد کمپیوٹر' انٹرنیٹ' انٹراسپیس' جینٹک اور نیوکلیئر ٹیکنالوجی کے عظیم دھماکوں سے گلوبلائزیشن کا نیا ورلڈ آرڈر پیدا ہوا جدید ورلڈ آرڈر سے پہلے'

امریکہ قومیت کا علم بردار تھا اب سرمائے کی نئی ضرورتوں کے تحت قوموں کے ادغام کا علمبردار ہوگیا۔ ٹیکنالوجی میں شراکت، مشترکہ پیداوار، مشترکہ کرنسی مشترکہ مارکیٹ، مشترکہ منافع اور مشترکہ تجارت کے ذریعے اس گلوبلائزیشن کے عمل کو آگے بڑھایا گیا۔ آج عالمی معیشت کا کنٹرول اس عمل کے نتیجے میں فقط دوسو بڑی بین الاقوامی کمپنیوں کے ہاتھوں میں سرمائے کا ارتکاز خوفناک حد تک پہنچ چکا ہے ۔ ہر روز کھربوں ڈالر کا کاروباری لین دین سرحدیں پار کررہا ہے ملٹی نیشنلز منافع کی دوڑ میں ایک دوسرے کو نگل رہی ہیں اس کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ طاقت ناقابل تصور حد تک کم سے کم کمپنیوں کے ہاتھوں میں منتقل ہورہی ہے۔ ٹیکنالوجی اور سرمایہ کے نجی استعمال سے ہر سطح پر اجارہ داریاں پیدا ہوئیں اور ان کی خودمختاری میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

موجودہ صورت حال میں قومی ریاستیں گلوبلائزیشن اور ملٹی نیشنلز کے پھیلاؤ کی وجہ سے خطرے میں ہیں جو ان کی طاقت اور اختیارات کے دائرے کو محدود کررہی ہیں۔

قومی ریاستیں اب تقریباً وہی کردار انجام دے رہی ہیں جو سرمایہ داری کے آغاز سے پہلے چھوٹی چھوٹی مقامی ریاستیں ادا کرتی تھیں۔ ا۔ کمزور قوموں کو جدوجہد کی بڑی بڑی جمعتی طاقتیں نہایت چالاکی سے ریزگاری کی طرح استعمال کررہی ہیں اور پسماندہ سماجوں کو قائم دائم رکھنے کے لیے ڈھال کے طور پر استعمال کررہی ہیں۔ غیر ملکی سرمایہ، اسلحہ اور ٹیکنالوجی ایسے پریشر لیور پیدا کرتے ہیں کہ وہ جب چاہیں قومی، معاشی، سیاسی اور سماجی منصوبوں کو مفلوج کرسکتے ہیں۔ سامراج نے اپنی سیاسی اور مالیاتی بالادستی کے لیے ورلڈ بنک، آئی ایم ایف، ڈبلیوٹی اور جیسے بین الاقوامی ادارے تشکیل دے رکھے ہیں کہ ان کے شکنجوں سے نکلنا مفتوح قومی ریاستوں کے لیے ممکن نہیں ہے کمزور قومیں کیسے آزاد ہوسکتی ہیں؟ جب تک عوام معاشی قوت کے انفرادی ارتکاز کے عوامل سے نجات نہیں پاسکتے وہ معاشی سیاسی اور سماجی طور پر خوداختیار بھی نہیں ہوسکتے۔

(جاری ہے)

وینزویلا۔ بولیویرین انقلاب

صباالدین صبا

یوں تو 1998 میں ہیوگوشاویز کے برسراقتدار آنے کے بعد سے ہی امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے وینزویلا میں دباؤ، مداخلت اور سازشوں میں اضافہ کردیا تھا۔ لیکن وینزویلا کے موجودہ صدر نکولس ماڈورو نے 20 مئی 2018 کو دوسری مدت کیلئے صدارتی انتخاب میں کامیابی حاصل کی تو مغربی ممالک خاص طور سے امریکی حکمرانوں کی نیندیں اُڑ گئیں۔ اس سے پہلے 30 جولائی 2017 کو آئین میں ضروری تبدیلیوں کی غرض سے صدر ماڈورو نے دستور ساز اسمبلی کا انتخاب کرایا۔ ان کے حامیوں کی اکثریت پر مشتمل دستور ساز اسمبلی نے اس قومی اسمبلی کو خطرے میں ڈال دیا جس کے سربراہ جوان گائڈو اور دیگر پر امریکی حکمرانوں نے بہت کچھ داؤ پر لگا رکھا تھا۔ دستور ساز اسمبلی کے قیام کے فوراً بعد امریکہ نے صدر ماڈورو کو آمر قرار دینے کے ساتھ ساتھ اقتصادی پابندیوں، اور امریکہ میں ان کے اثاثے منجمد کرنے کا اعلان کردیا۔ امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے دستور ساز اسمبلی اور 2018 کے صدارتی انتخابات کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ اس کے مقابلے چین، کیوبا، ایران، روس اور ترکی نے وینزویلا کی مدد جاری رکھنے اور اس کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی مذمت کرنے کا اعلان کیا۔ اس تناظر میں 23 جنوری 2019 کو وینزویلا کی قومی اسمبلی کے صدر جوان گائیڈو نے خود کو ملک کا قائم مقام صدر قرار دے دیا۔ امریکہ اور پسما گروپ نے انھیں صدر تسلیم کرنے کا اعلان کردیا۔ منطقی طور پر اس کے ردعمل میں صدر ماڈورو نے امریکہ سے سفارتی تعلقات منقطع کردیئے۔ اس طرح وینزویلا کی صورتحال ایک نئے مرحلے میں داخل ہوگئی۔ جو یقیناً پوری دنیا اور خاص طور سے ان عناصر کیلئے خاص دلچسپی کی حامل ہے جو لاطینی امریکی ممالک میں ایک نئی بیداری، سوشلزم کی یافت اور سامراج مخالف جدوجہد کی نئی کامیابیوں میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

اس بات سے قطع نظر کہ وینزویلا حکومت کی اپنے عوام کے حق میں کارکردگی کیسی ہے۔ یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ وینزویلا کے عوام کو اس وقت جو سب سے بڑا خطرہ ہے وہ امریکی سامراج سے درپیش ہے۔ وینزویلا کی آزادی اور خودمختاری کو

امریکی سامراج کے مداخلت اور سازشوں خطرات لاحق ہیں جسے کسی اصول کے تحت جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ لہذا دنیا بھر کے امن پسند انصاف پسند اور سامراج مخالف عناصر کیلئے لازم ہے کہ وہ لاطینی امریکہ میں امریکی سامراج اور اس کے اتحادیوں کی مداخلت، اور جارحیت کی غیر مشروط مخالفت کریں۔

عہد حاضر کے عظیم مارکسی دانشور اور انٹرنیشنل لیگ آف پیپلز اسٹرگل کے چیئرپرسن جوزمایط سیسن نے درست کہا ہے کہ

> Vigorously support the demecratically elected prsident of peoples republic of venzula Nicholas Maduro and condemn juan guarido who has Proclamed himself the interim presedent in a brazen coup attempt Guadio is merely a stooge of US imperialism and representing ultra reactionaries of venzula .

واضح رہے کہ وینزویلا کے پاس تیل کے وسیع ذکائر ہیں امریکی سامراج کی اس میں دلچسپی کی اصل وجہ ہے ایک انداز ے کے مطابق وینزویلا کے پاس 300878 ملین بیرل تیل کے ذخائر ہیں ۔ جبکہ سعودی عرب کے پاس 280.455 بیرل عراق کے پاس 142.503 بیرل روس کے پاس 80000 بیرل لیبیا کے پاس 48000 بیرل تیل کے ذخائر ہیں۔

تیل کی دولت سے مالا مال ہونے کے باوجود دیگر لاطینی امریکی ممالک کی طرح وینزویلا کے عوام بھی غربت اور ستحصال کا شکار تھے۔ ہیوگو شاویز نے ایک فوجی افسر ہونے کے باوجود اپنے ملک کو سامراج اور مقامی رجعت سے نجات دلانے کا سوچا۔ انھوں نے کچھ دوستوں کے ساتھ ملکر 1992 میں فوجی بغاوت کی کوشش کی جس میں انھیں ناکامی ہوئی اور انھیں دو سال کی قید کاٹنی پڑی۔ بعدازاں انھوں نے 1998 کے صدارتی انتخاب میں کامیابی حاصل کر کے ملک کی صدارت سنبھالی۔ انھوں نے وینزویلا میں سامراج، اور رجعت کے خلاف استحصال اور ظلم کے خاتمے کیلئے سوشلسٹ راہ اختیار کرنے کا اعلان کیا۔ انھوں نے جدید نو آبادیاتی فوج کو عوامی فوج میں منتقل کرنے، اور آئینی اداروں کی عوام کے حق میں تبدیلی کے اعلانات کیئے۔ اور اس حوالے سے دستور ساز اسمبلی کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔ نئی حکومت کے اقدامات سے تیل کی صنعتوں کو چلانے والے اجارہ داروں کاروباری اشرافیہ جائیدادوں کے مالکان اور روایتی سیاسی جماعتوں نے ان کی مخالفت اور مزاحمت شروع کی۔ سامراجی ممالک خاص طور سے امریکی سامراج نے وینزویلا کے رجعتی عناصر کی ہر طرح سے پشت پناہی شروع کی۔ شاویز حکومت نے بغاوت کی کئی کوششوں کو عوام کے بھرپور تعاون سے ناکام بنایا۔

5 مارچ 2013 کو ہیوگو شاویز کے انتقال پر نکولس ماڈورو نے صدارتی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ اور 14 اپریل 2013 کو انھیں باقاعدہ صدر منتخب کیا گیا۔ یونائیٹڈ سوشلسٹ پارٹی وینزویلا کے امیدوار کی حیثیت سے انھوں نے 50.62 فیصد ووٹ حاصل کیئے۔ 20 مئی 2018 کو انھیں دوسری مدت کیلئے ملک کا صدر منتخب کیا گیا۔ ماڈورو پیشہ کے اعتبار سے ڈرائیور ہیں۔ اور انھوں نے ٹریڈ یونین لیڈر کی حیثیت سے سیاست مین حصہ لینا شروع کیا۔

شاویز اور پھر ماڈور کی حکومت نے امریکی سامراج اور مقامی رجعتی عناصر کی طرف سے پیدا کردہ معاشی مشکلات کے باوجود پولیویرین انقلاب کے مقاصد کے حصول کی کوششیں ہر حال میں جاری رکھیں۔

نئی حکومت نے آئل پروجیکٹس سمیت بیرون ملکیت کے حامل درجنوں منصوبوں کو قومی تحویل میں لیا جن میں 04 Exx موبلز اور دیگر بڑی امریکی کمپنیاں شامل ہیں۔

تیل سے حاصل ہونے والی آمدن کو کو فلاحی منصوبوں کیلئے استعمال کیا گیا۔ عوام اور خاص طور سے ضرورتمندوں کو ارزاں قیمت پر خسامہیا کرتے کیلئے اسٹورز قائم کیئے گئے۔

بیرونی تجارت میں بھی بارٹر سسٹم کو اختیار کیا گیا۔ کیوبا کو تیل کی فراہمی کے بدلے کیوبا سے ڈاکٹر بلائے گئے۔ جو وینزویلا کے عوام کو مفت علاج مہیا کر رہے ہیں۔

تیل کے سب سے بڑے ذخائر کے حامل ملک میں نجی ملکیت کی نوعیت میں بنیادی تبدیلی کا عمل مقامی رجعتی قوتوں اور سامراج کیلئے کسی طور قابل قبول نہیں صدر ہیوگو شاویز کی زندگی میں ہی امریکی سامراج نے مقامی رجعتی قوتوں کے

ذریعہ مل کر وینزویلا کی منتخب جمہوری حکومت کا تختہ الٹنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ لیکن آج بھی صدر ماڈورو کی قیادت میں وینزویلا کی حکومت ردعمل انقلاب کی قوتوں کے خلاف برسرپیکار ہے۔

امریکی حکمرانوں نے وینزویلا میں فوجی بغاوت کی بھی کوششیں کرنے سے گریز نہیں کیا۔ ایسی ہی ایک حالیہ کوشش بھی ناکام بنائی جا چکی ہے۔ بعض دوستوں کی شکایت ہوتی ہے کہ وینزویلا حکومت اپنے عوام کی حالت بہتر بنانے میں کامیاب ثابت نہیں ہو رہی۔ لیکن ان دوستوں کی توجہ امریکہ اور دیگر رجعتی قوتوں کی سازشوں پر نہیں ہوتی۔ یہ امریکی سامراج اور مقامی رجعتی قوتیں ہیں جو وینزویلا میں سیاسی و معاشی استحکام پیدا ہونے نہیں دیتیں جس کی وجہ سے عوام دوست حکومت کی اصلاحات مطلوبہ نتائج کے حصول میں سست نظر آتی ہیں۔ البتہ وینزویلا میں ہونے والی سامراج مخالف تبدیلی کو برقرار رکھنے اور دیا انقلاب کی قوتوں کا کامیابی سے مقابلہ کرنے کے حوالے سے حکومت کے پاس کیا موثر حکمت عملی ہے اس بارے میں کچھ کہنا ابھی مشکل ہے۔ بولیویرین انقلاب کے رہنما ہیو گوشاویز نے وینزویلا کے انقلاب کو بیسویں صدی کے سوشلسٹ انقلابوں سے مختلف قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ

> A revolution has to produce not only food goods , and services , it also has to produce more improtantly of all of those things new human being, new man , new women

مقاصد اعلیٰ انسانی اقدار اور مارکس کی تعلیمات کے عین مطابق ہیں۔ لیکن رد انقلاب کی قوتوں کا مقابلہ کرنے کیلئے ایک باشعور منظّم، ٹھوس قوت کی کمی اب بھی محسوس ہوتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہولیورین انقلاب کے دفاع کیلئے قائم کی گئی کولیکٹوز (Collectivs) کس حد تک منظّم ہیں اور وہ کسی ناخوشگوار صورتحال کا مقابلہ کرنے کیلئے تیار ہیں یا نہیں۔☆

جلیانوالہ باغ کا خونی سانحہ

برطانوی سامراج کی بربریت اور تحریکِ آزادی کا دردناک باب

پرویز فتح

جلیانوالہ باغ کا خون ریز واقعہ برصغیر ہندوستان پر برطانوی سامراج کے قبضہ اور نوآبادیاتی راج کو برقرار رکھنے کے لیے ڈھائے جانے والے جبر و استبداد، ظلم و ستم اور بربریت کے واقعات میں سے سب سے زیادہ وحشیانہ اور خونی تھا، جس میں 1,500 سے زائد پرامن شہری براہِ راست فائرنگ کر کے شہید کر دیئے گئے۔ یہ ہماری قومی آزادی کی تحریک کا سب سے دردناک باب ہے۔ جلیانوالہ باغ سانحہ کو اس سال 13 اپریل کو سو سال مکمل ہو جائیں گے اور برطانیہ میں مقیم پاکستانی، ہندوستانی اور بنگلہ دیشی نژاد سیاسی و سماجی کارکنوں نے برصغیر کی تحریکِ آزادی کے لیے دی گئی قربانیوں سے متعلق اپنی نئی نسل میں آگہی پیدا کرنے، جلیانوالہ سانحہ کے شہیدوں کو انصاف دلانے اور برطانوی سرکار سے اس واقع پر کھلی معافی مانگنے کا مطالبہ کرتے ہوئے برطانیہ بھر میں سو سالہ تقریبات منعقد کرنے اور برطانوی شہریوں میں آگہی پیدا کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں نیشنل کمیٹی تشکیل دے دی گئی ہے، جبکہ ریجنل کمیٹیاں تشکیل کے مراحل میں ہیں، جن میں لیڈز، بریڈفورڈ، مانچسٹر، نیوکاسل، برمنگھم، لیسٹر اور لندن قابلِ ذکر ہیں۔

زمانہ قدیم کا انسان جنگلوں اور غاروں سے نکل کر کھیتی باڑی کے دور میں داخل ہوا اور ایک طویل عرصہ تک اجتماعی سماجی زندگی یا ابتدائی اشتراکی زندگی کی ارتقائی منازل طے کر رہا تھا۔ سماجی زندگی کی انہی ارتقائی منازل کے دوران نجی ملکیت نے جنم لیا تو غیر طبقاتی سماج طبقاتی معاشرے میں تبدیل ہو گیا۔ حاکم و محکوم، آقا اور غلام، ظالم اور مظلوم کے تصورات متشکل ہوئے اور یہیں سے ہی طبقاتی کشمکش اور چھینے ہوئے حقوق کے حصول کی اس طویل جدوجہد کا آغاز ہوا جو آج بھی جاری ہے۔

عہدِ غلامی اور پھر کرہ ارض پر ایک مدت تک زمینداری اور جاگیرداری نظام رہا۔ دنیا کے اکثر ممالک میں بادشاہت کا تسلط اسی نظام کا مظہر تھا۔ اسی زمانہ میں انسان قبیلوں میں بٹ چکا تھا۔ قبائل کی باہمی لڑائیاں اور ایک دوسرے کے علاقوں پر قبضہ اور اپنے سے کمزور قبائل کے انسانوں کو غلام بنا لینا روزمرہ کا معمول بن گیا

تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ قبائل کے سرداروں کی جگہ بڑے بڑے جاگیرداروں اور بادشاہوں نے لینی شروع کر دی۔ پہلے صنعتی انقلاب نے بعض ریاستوں کو اس قدر طاقتور بنا دیا کہ وہ چھوٹے اور غریب ممالک پر قبضے کرنے لگے۔

نوآبادیاتی نظام (کولونیل سسٹم) کا آغاز 15ویں صدی میں نئی ایجادات اور ذرائع آمدورفت کی ترقی سے ہوا، جب پرتگال اور سپین نے امریکہ، افریقہ، مشرقِ وسطیٰ، ہندوستان اور مشرقی ایشیا کو دیافت کیا۔ اس طرح دنیا کے نقشے پر پرتگال اور سپین پہلے بڑے سامراجی ممالک کے طور پر ابھر کر سامنے آئے، کیونکہ انہوں نے دنیا کے نقشے کے بڑے حصوں تک پہلے رسائی حاصل کی تھی۔ 16ویں اور 17ویں صدی میں برطانیہ، فرانس اور ڈچ ریپبلک نے بھی بعض دیگر ممالک پر قبضہ کر کے اپنی سلطنت کے جھنڈے گاڑ دیئے تھے۔ 18ویں صدی کے اختتام اور 19ویں صدی کے آغاز میں براعظم امریکہ کی بہت سی ریاستوں نے یورپین ممالک کے تسلط سے آزادی حاصل کر لی۔

سپین اپنی کالونیاں کھو جانے کے بعد بہت کمزور ہو گیا اور اپنی سامراجی طاقت کو برقرار نہ رکھ سکا۔ البتہ برطانیہ، فرانس، پرتگال اور ڈچ نے پرانی دنیا بالخصوص جنوبی افریقہ، ہندوستان اور جنوب مشرقی ایشیا پر توجہ دینا شروع کر دی، جہاں کچھ ایسی محکوم ریاستیں پہلے ہی قائم ہو چکی تھیں۔ 19ویں صدی کے آغاز میں دوسرے صنعتی انقلاب نے ایک نئے نوآبادیاتی دور کا آغاز کر دیا اور افریقہ، ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ کے ممالک پر بڑی تیزی سے سامراجی تسلط قائم ہونے لگا۔ اس کے برعکس نوآبادیاتی نظام اور سامراجی غلبے کے خلاف آزادی کی تحریکوں نے بھی انقلابی شکل اختیار کرنا شروع کر دی، جس نے ایک طرف تو سامراجی طاقتوں کی جانب سے کمزور ممالک کو کنٹرول کرنے اور دوسری طرف آزاد ریاستوں کے قیام کے خدوخال متعین کئے۔

19ویں صدی میں برطانیہ میں صنعتی ترقی ہو چکی تھی۔ کپڑے کی صنعت بہت تیزی سے بڑھی تو خام مال کے لیے برصغیر ہی برطانوی سامراج کی سب سے زرخیز کالونی تھی۔ اپنی کپڑے کی صنعت کا خام مال پیدا کرنے کے لیے برطانوی سامراج نے برصغیر میں نہروں کا جال بچھایا اور ریلوے کو ملک کے دوردراز علاقوں تک پہنچا دیا تا کہ کاٹن پیدا کر کے ریلوے نظام کے ذریعے برطانیہ تک پہنچا سکے اور اپنی کپڑے کی صنعت کو فروغ دے سکے۔ بعض سامراجی کارندے اور ریاستی مشینری یہ پراپیگنڈہ کرنے لگی کہ برطانیہ ہندوستان کی ترقی کر رہا ہے اس لیے اس کی حمایت کی جائے۔

جولائی 1914 میں پہلی عالمی جنگ میں برطانوی سامراج بری طرح مشکلات میں گھر چکا تھا۔ جنگ کی تباہ کاریوں سے ہر طرف خوف اور افراتفری پھیلی ہوئی تھی، مہنگائی آسمان سے باتیں کر رہی تھی جبکہ جنگ کے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے نئے نئے ٹیکس لگائے جا رہے تھے۔ روزگار سکڑ رہے تھے۔ ٹیکس بڑھ رہے تھے اور لوگوں کا جینا مشکل ہو رہا تھا۔ ملک بھر میں سامراجی حکومت کے خلاف نفرت میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔ اس سب کے باوجود جنگ کے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے ہندوستان نے مفلوک الحالی کے باوجود اپنی بساط سے زیادہ حصہ ڈالا اور اپنے بچوں کے منہ سے نوالے چھین کر 12 کروڑ 78 لاکھ پاؤنڈز کی خطیر رقم عطیہ کی، جو آج کے دور میں ٹریلینز آف پاؤنڈز کے برابر بنتی ہے۔

جنگ کے دوران صرف پنجاب سے 3 لاکھ 60 ہزار افراد فوج میں بھرتی ہو کر ملک سے باہر گئے جو کل بھرتی کا نصف سے زائد تھے۔ عوام نے انگریز سامراج کی جانب سے عالمی جنگ کے بعد خودمختار حکومت کے وعدہ کی لاج رکھتے ہوئے یہ اقدام اٹھایا تھا۔ اسی دوران روس میں عوام نے سوشلسٹ انقلاب برپا کر دیا جس نے دنیا بھر کی محکوم اقوام اور پسے ہوئے طبقات کو سامراجی غلامی سے آزادی کی نئی راہ دکھلائی۔ دنیا بھر میں قومی آزادی کی تحریکوں میں تیزی آ گئی جس سے سامراجی ممالک بکھلا گئے۔ ادھر نومبر 1918 میں جنگ ختم ہوگئی تو جنگ میں فتح سے برطانوی سامراج اور اس کی مقامی حکومت کو بہت تقویت ملی اور وہ اصلاحات نافذ کرنے کے وعدوں سے مکر گئی اور انہوں نے جسٹس سڈنی رولیٹ کی سفارشات کے مطابق انتہائی ظالمانہ اور غیر مہذب قوانین وضع کئے۔ انہوں نے فروری 1919 میں مرکزی قانون ساز اسمبلی میں دو مسوداتِ قانون پیش کئے جن میں سے ایک انڈین کریمنل لاء اور دوسرا ایمرجنسی پاورز کا بل تھا۔ مارچ میں دونوں مسودات مختلف مراحل طے کرنے کے بعد قانون کی شکل اختیار کر گئے۔ ان قوانین کا مقصد انفرادی آزادی اور سیاسی سرگرمیوں پر ناروا پابندیاں عائد کرنا تھا۔ ان کے ذریعے انتظامیہ اور پولیس کو وسیع تر اختیارات دے دیئے گئے تھے جیسے

حکومت کسی بھی شخص کو پکڑ کر بغیر مقدمہ چلائے غیر معینہ مدت کے لیے جیل میں ڈال سکتی تھی۔

- ایسے شخص کو عدالت سے رجوع کر کے دادرسی کے قانونی حق سے محروم بنا دیا گیا تھا۔

- کالے قوانین کے ذریعے پریس کی آزادی پر بھرپور وار کیا گیا تھا اور انتظامیہ بغیر وجہ بتائے اخبار کا ڈکلیریشن منسوخ کرنے کی مجاز تھی۔

اخبارات کو حکومت کی لاقانونیت کے خلاف عدالت میں قانونی چارہ جوئی

کا حق حاصل نہ تھا۔غرضیکہ ناوکیل، نااپیل اور نادلیل تھی۔

ان ایام میں شاہی قانون ساز کونسل میں حکومت کے نامزد کردہ ارکان کی اکثریت ہوتی تھی۔منتخب ارکان نے بل کی بہت مخالفت کی لیکن حکومت نے نامزد ارکان کی حمایت سے بل منظور کروالیا اور وائسرائے نے دستخط کر دیئے۔اس کے ساتھ ہی قانون ساز کونسل کے منتخب ارکان نے استعفےٰ دینے شروع کر دیئے جن میں محمد علی جناح اور سر سنکرن نائر قابلِ ذکر ہیں، جبکہ نامور قومی شاعر ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور نے سر کا خطاب واپس کر دیا۔حکومت قانون بنانے میں کامیاب ہوگئی تو گاندھی جی نے ہڑتال کی کال دے دی۔ بعدازاں ہڑتال کا دن تبدیل کر کے 6 اپریل کر دیا گیا لیکن عوام نے پہلے اعلان کے مطابق ہڑتال کو کامیاب بنایا اور اپنے زبردست احتجاج کا مظاہرہ کیا۔حکومتی ہٹ دھرمی سے لوگ مشتعل ہو چکے تھے اور وہ صبر کرنے کو تیار نہ تھے۔ یوں ملک ہنگاموں کی لپیٹ میں آ گیا۔حکومت بوکھلا گئی اور اس نے ڈاکٹر ستیہ پال کے امرتسر شہر سے باہر جانے، تقریر کرنے یا بیان جاری کرنے پر پابندی لگا دی اور تین روز بعد ان سے نیک چلنی کی ضمانت طلب کر لی ایسے اقدامات عوامی جذبات بھڑکاتے ہے اور احتجاج شدت اختیار کرتا گیا۔ 4 اپریل کو ڈاکٹر سیف الدین کچلو، لالہ دینا ناتھ اور دیگر راہنماؤں پر بھی تقریر کرنے کی پابندی لگا دی گئی۔

ان حالات میں عوام برطانوی سامراج اور ان کے کارندوں کو دشمن سمجھنے لگے اور بلا لحاظ رنگ، نسل اور مذہب کے فقید المثال اشتراکِ عمل کا مظاہرہ کرنے لگے۔ ہندو مسلمان اور سکھ کی تمیز ختم ہو چکی تھی اور بھائی چارے، یگانگت اور باہمی اتحاد کی نئی لہر ہر طرف نظر آ رہی تھی۔ سامراج کی روایتی حکمت عملی 'پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو!' بری طرح ناکام ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کی قائدانہ صلاحیتوں اور سیاسی فراست سے رام نومی کے تہوار پر باہمی اتحاد کی دلکش صورت نظر آئی کہ اس روز ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں نے ایک پیالے میں پانی پیا، جلوس نکالا اور اپنے مطالبات کے حق میں زبردست نعرے بازی کی۔ رام نومی کا تہوار جس میں سامراجی حکومت اور اس کے کارندے مذہبی منافرت پھیلانا چاہتے تھے، نہ صرف امن وسلامتی سے گذر گیا بلکہ اپنے پیچھے باہمی اتحاد کی ایک زبردست نئی تاریخ چھوڑ گیا۔ یہ اہلِ وطن بالخصوص آزادی کی تحریک کے لیے بہت سودمند ثابت ہوئی اور لوگ یک جان ہو گئے۔

حکومت کا خیال تھا کہ اگر قیادت کو عوام سے جدا کر دیا جائے تو عوام کے جذبات کو ٹھنڈا کیا جا سکے گا۔ اسی نقطۂ نظر کے تحت انہوں نے بڑی چالاکی سے صلاح ومشورہ کے بہانے ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کو ڈپٹی کمشنر کے بنگلہ پر بلایا۔ جب دونوں ڈاکٹر صاحبان وہاں پہنچے تو ان سے ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت امرتسر چھوڑنے کے حکم کی تعمیل کرائی گئی اور انہیں ایک کار میں بٹھا کر امرتسر سے باہر بھیج دیا گیا۔ پولیس نے ان کے ساتھیوں کو روک رکھا تھا تاکہ دونوں ڈاکٹر صاحبان کے خلاف کاروائی کی خبر شہر میں نہ پہنچ سکے۔ جب صبح کے گئے ہوئے ڈاکٹر صاحبان دوپہر تک واپس نہ لوٹے تو لوگوں میں تشویش پیدا ہوئی اور یہ قیاس آرائی کی جانے لگی کہ قائدین کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔اس سے زبردست اشتعال پھیل گیا۔

ان کی گرفتاریوں کے خلاف احتجاجی جلسہ ہوا اور فیصلہ ہوا کہ وفد بنا کر ڈپٹی کمشنر سے ملاقات کی جائے اور قیادت کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں۔ جب وفد ڈپٹی کمشنر کی رہائش گاہ کی طرف جانے لگا تو حاضرین جلسہ بھی ساتھ چل پڑے۔ جوش وولولے سے سرشار ہجوم کو گھڑسوار فوج کے مسلح دستوں نے راستہ میں روک لیا۔اس عرصہ میں گھڑسوار فوجیوں میں سے ایک نے گولی چلا دی جس سے دو احتجاجی شہری زخمی ہو گئے۔اس سے ہجوم مشتعل ہو گیا اور اس نے پاس پڑے اینٹوں کے ڈھیر سے اینٹیں اٹھا کر فوجیوں پر پھینکنا شروع کر دیں۔فوج نے فائرنگ شروع کر دی جس سے کئی لوگ جان بحق ہو گئے جن کی تعداد کوئی 20 کے قریب تھی جبکہ بے شمار زخمی ہو گئے تھے۔ لوگ کہہ رہے تھے حکومت نے وعدہ خود اختیاری کا کیا تھا لیکن دے گولیاں رہی ہے۔اس خون ریز واقع کی اطلاع شہر بھر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور امرتسر آتش فشاں بن گیا۔ پرامن شہری بپھر گئے۔قتل وغارت اور لوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا۔اب بپھرے ہوئے مشتعل عوام سے کوئی غیر ملکی شہری یا املاک محفوظ نہ تھی۔ گوروں کو مارا گیا، بینکوں کو لوٹا گیا اور ڈاک خانوں کو جلا دیا گیا۔

اس سے قبل ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال نے گاندھی جی کو امرتسر آنے کی دعوت دے رکھی تھی۔ جب وہ 7 اپریل کو دھلی سے امرتسر کے لیے روانہ ہوئے تو انہیں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ ادھر 10 اپریل کی فائرنگ سے ہلاک ہونے والوں کی میتوں کو ٹھکانے لگانا انتظامیہ کے لیے مسئلہ بن گیا تھا۔حکومت نے تمام اجتماعات پر پابندی عائد کر دی اور جنازے کے ساتھ صرف 8 افراد کو جانے کی اجازت تھی۔ پندرہ منٹ کے وقفے سے جنازے شہر کے اہم علاقوں سے گذر کر قبرستان شمشان بھومی جا سکتے تھے۔

اب جابرانہ احکامات کا عوام پر ذرہ برابر بھی اثر نہ ہوتا تھا۔عملاً شہر سے باہر انگریزوں کی حکومت تھی اور شہر کے اندر ہندو مسلم راج تھا۔حکمران اپنے جاہ وجلال کو ڈوبتے ہوئے دیکھ رہے تھے اور وہ جانتے تھے کہ یہ صورت حال ایسے ہی رہی تو

برطانیہ کو سرزمین ہندوستان سے بوریا بستر لپیٹ کر رخصت ہونا پڑے گا۔ امرتسر اور دھلی کے علاوہ قصور، لاہو، گوجرانوالہ، لائل پور، گجرات، شیخوپورہ، وزیرآباد اور دیگر شہروں سے، جواب پاکستان کا حصہ ہیں، حکومت کے لیے دل شکن اطلاعات موصول ہورہی تھیں اور سامراج سے نجات کی لہر دور دراز دیہاتوں تک پھیل چکی تھی۔

جلیانوالہ سانحہ سے ایک روز قبل، 12 اپریل کی رات سنت نگر امرتسر میں ایک جلسہ عام منعقد ہوا جس میں 13 اپریل کو جلیانوالہ باغ میں جلسہ عام کرنے کا اعلان کیا گیا۔ اگرچہ حکومت نے صبح ہی سے جلسہ کرنے پر پابندی عائد کردی تھی لیکن دن بھر جلیانوالہ جلسہ عام کا اعلان ہوتا رہا۔ حکومت نے حکم جاری کر دیا کہ رات 8 بجے کے بعد اگر کوئی شخص گھر سے باہر نکلا تو اسے گولی ماردی جائے گی۔ چار آدمیوں سے زیادہ ایک جگہ پر اکٹھے ہونے کو جرم قرار دے دیا گیا تھا۔

جنرل ڈائر فوج کا کمانڈر تھا اور اس نے امرتسر کے ابتر حالات کے پیش نظر جالندھر سے مزید فوج بلالی تھی۔ اس نے 13 اپریل کی صبح مشین گنوں اور خودکار اسلحہ سے لیس دستوں کے ساتھ شہر کا گشت کیا تا کہ لوگوں پر دھشت طاری کی جا سکے۔ عوام بے خوف وخطر باہر نکل آئے۔ 13 اپریل کو بیساکھی کی پہلی تاریخ ہوتی ہے۔ امرتسر میں اس وز میلے کا سا سماں ہوتا ہے اور دور دراز سے لوگ بیساکھی میلہ میں شرکت کے لیے آتے ہیں۔ اس میلے کا مرکز بھی جلیانوالہ باغ ہی ہوتا ہے۔ اس لیے میلہ میں شامل لوگ بھی جلسہ میں شریک تھے۔ 4 بجے بعد دوپہر تک جلسہ گاہ میں تل دھرنے کو جگہ نہیں بچی تھی۔ اس سانحہ میں زخمی ہونے والوں کے مطابق وہاں 35 سے 40 ہزار کے قریب انسانوں کا جمِ غفیر تھا۔

جنرل ڈائر نہتے اور پرامن شہریوں کے خون سے پیاس بجھانے کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ اسے جونہی ایس پی نے جلسہ شروع ہونے کی رپورٹ دی تو اس نے فوج کو جلیانوالہ باغ کی جانب کوچ کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ فوجی قافلے کے آگے آگے دو فوجی کاریں تھیں جن پر مشین گنیں نصب کی ہوئی تھیں۔ قافلہ جونہی جلیانوالہ باغ پہنچا تو باغ کا واحد راستہ صرف تین فٹ چوڑا تھا اور مشین گنوں سے مسلح کاروں کو باہر چھوڑ کر جانا پڑا۔ اس وقت شام کے 5 بج چکے تھے۔ اس جلسہ کی صدارت ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو کرنا تھی لیکن فرنگی حکومت نے انہیں گرفتار کر کے شہر کے باہر پہنچا دیا تھا۔ اب جلسہ کی صدارت ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی تصویر کر رہی تھی۔ جب جنرل ڈائر اپنے فوجی دستوں کے ہمراہ جلسہ گاہ میں داخل ہوا تو وہاں انسانی سروں کا جنگل نظر آ رہا تھا۔ جلسہ پورے جوش وخروش سے جاری تھا اور اس وقت مسٹر درگا داس خطاب کر رہے تھے۔ اس سے قبل 16 مقررین خطاب کر چکے تھے۔ تقاریر رولیٹ ایکٹ کے خلاف ہو رہی تھیں۔ فوج کو دیکھ کر تھوڑی سی ہل چل ہوئی جو جلد ختم ہوگئی۔ اسی دوران جلسہ گاہ کے اوپر فوجی طیاروں نے پرواز کی تو ایک مرتبہ پھر کھلبلی مچ گئی لیکن جلسہ کی کاروائی جاری رہی۔ راہنما کہہ رہے تھے ہمیں جلسہ کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ تقریر، تحریر اور اجتماع کی آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے جس سے کسی کو محروم نہیں بنایا جا سکتا۔ ہندوستان کسی ایسے قانون کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہے جس سے بنیادی انسانی حقوق متاثر ہوتے ہوں۔ توپوں اور بندوقوں کی نمائش سے انسانی آزادی کو چھینا نہیں جا سکتا۔ اچانک جنرل ڈائر نے گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ پرامن اور نہتے سامعینِ جلسہ کو گولیوں سے بھون ڈالا۔ جوان، بوڑھے، بچے اور عورتیں اس بربریت کا شکار ہوئیں۔ چیخ وپکار آسمان کو چھو رہی تھی۔ جلیانوالہ باغ کے اندر ایک بڑا کنواں تھا اور لوگ اپنی جان بچانے کے لیے کنویں میں کودتے رہے اور کنواں انسانوں سے بھر گیا۔ جنرل ڈائر نے دس منٹ تک فائرنگ کو جاری رکھا تاوقتیکہ اسلحہ ختم ہوگیا۔ سینکڑوں بے گناہ لوگ موقع پر ہی شہید ہوگئے اور بیشمار زخمی بروقت طبی امداد نہ ملنے کی وجہ سے جان کی بازی ہار گئے۔ ان میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی اور سکھ بھی تھے اور عیسائی بھی، لیکن سب انسان تھے۔ ان کا ایک ہی جرم تھا، آزادی کی خواہش، آزادی کی تمنا اور آزادی کی آرزو۔ انہوں نے آزادی کے حصول کے اعلیٰ مقصد کی خاطر جانوں کا نذرانہ پیش کر کے برصغیر کی آزادی کی راہ اپنے مقدس خون سے متعین کر دی۔

جنرل ڈائر اپنی سفاکی اور خونخواری پر قائم رہا اور بالکل ندامت محسوس نہ کی۔ 25 اگست 1919 کو اس نے جو بیان دیا اس پر عمر بھر سختی سے قائم رہا۔ وہ برصغیر کے عوام کی نظر میں ایک درندہ صفت انسان تھا ہی، مگر اس کا اقدام اس کے ہم وطنوں کے نزدیک بھی بے رحمانہ قتل عام تھا۔ 1920 میں جنرل ڈائر کے وحشیانہ اقدام پر برطانیہ بھر میں شدید شور برپا ہوا اور برطانوی رائے عامہ دو حصوں میں بٹ گئی۔ برطانیہ کی آبادی کا بڑا حصہ اس درندگی، بربریت اوسفاکی کو برطانوی سامراج کے دامن پر بدنما داغ تصور کرتا تھا۔ ان کے نزدیک ڈائر کا فعل جون آف آرک کو زندہ جلا دینے کے واقعے کے بعد سب سے زیادہ سنگین اور شرمناک واقعہ تھا۔ اس سے جنرل ڈائر کی ہی نہیں پوری برطانوی قوم کی دنیا بھر میں ذلت و رسوائی ہوئی تھی۔ اس خونریز واقع کے بعد برصغیر ایک دھکتا ہوا الاؤ بن گیا۔ غلامی کی زنجیریں اس تپش کی تاب نہ لاسکیں اور صرف اٹھائیس برسوں میں پگھل کر گر پڑیں۔

سانحہ جلیانوالہ کا ایک اور اہم کردار پنجاب کا لیفٹیننٹ گورنر سر مائیکل اڈوائر تھا، جسکی رضامندی اور اشیر باد کے بغیر جنرل ڈائر اس وحشیانہ درندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ 1919 کے اختتام میں جب وہ اپنے عہدے سے سبکدوش ہو کر

برطانیہ لوٹا تو اسکے جرائم اس کا پیچھا کرتے رہے۔ پنجاب کا ایک نوجوان سپوت اودھم سنگھ جو سانحہ جلیانوالہ باغ کے وقت صرف 19 برس کا تھا، اس کا پیچھا کرتا ہوا برطانیہ آ گیا۔ 13 مارچ 1940 کو سر مائیکل اڈوائیر لندن کے کاکسٹن ہال میں تقریر کر کے اپنی سیٹ پر بیٹھنے ہی والا تھا کہ اودھم سنگھ نے فائرنگ کر کے اسے ہلاک کر دیا۔ اودھم سنگھ نے بڑے فخر کے ساتھ اس قتل کا اعتراف کرتے ہوئے کہا 'میں نے اس جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ میرا سینہ جلیانوالہ باغ کے خونی سانحہ سے دھک رہا تھا۔ پولیس کو اس نے اپنا نام 'رام محمد سنگھ آزاد' بتایا اس طرح شہید اودھم سنگھ رام نومی تہوار کی طرح ایک بار پھر تمام مذاہب کے اتحاد کی علامت بن کر اپنے ملک اور اس کے شہیدوں کا انتقام لیتے ہوئے خوشی خوشی پھانسی چڑھ گیا۔

میں جلیانوالہ باغ سانحہ سو سالہ تقریبات کمیٹی کی جانب سے ان تمام خواتین و حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اپنی تصنیفات، جرائد، مضامین اور پمفلٹس کے ذریعے جلیانوالہ باغ سانحہ کے متعلق حقائق کی اشاعت کر کے اسے آنے والی نسلوں تک منتقل کیا، جس میں وکی پیڈیا پر شائع کی گئی رپورٹ، ہندوستانی ادیبہ محترمہ کشور ڈیسائی اور پاکستانی ادیب محمد فاروق قریشی کی تصانیف قابل ذکر ہیں۔

آج ہم جب جلیانوالہ باغ کی صد سالہ یاد میں تقریبات منعقد کر کے برطانوی حکومت سے اس وحشیانہ درندگی پر معافی مانگنے کا مطالبہ کر رہے ہیں تو اس کا پہلا اور بنیادی مقصد تو اپنے شہیدوں کو انصاف دلانا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم آج کے دور میں جاری جلیانوالہ جیسے سانحات، جو سامراج کی مسلط کردہ جنگوں کی صورت میں ترقی پذیر ممالک میں جاری ہیں، ان کے خاتمہ کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ترقی پذیر ممالک میں جاری جلیانوالہ باغ کی مثالیں دینا شروع کریں تو لسٹ ختم ہی نہ ہو۔ 1984 میں گجرات میں قتلِ عام، 12 مئی کو کراچی میں قتلِ عام، طالبان بنانا، طالبان مکانا، سب اسی کی کڑیاں ہیں اور یہ بربریت ہمارے اپنے ملکوں پہ مسلط سامراجی گماشتے حکمران اور بیوروکریسی ڈھاتی ہیں جو ہمارے ملکوں کے عوام اور ان کے وسائل پر قابض ہیں۔ نہ کوئی سیاسی حقوق، نہ معاشی حقوق، نہ تعلیم، نہ صحت، نہ روزگار، اور یہ حکمران گدھوں کی طرح ہمارے ملکوں کے وسائل اور عوام کو نوچ رہے ہیں۔ آؤ ہم سب مل کر اپنی آزادی کی تکمیل کے لیے ایک ایسی تحریک پیدا کریں جو حقیقی سماجی تبدیلی کی بنیاد بنے، جس میں ملک کا ہر شہری حقیقی طور پر آزاد، خودمختار اور خوشحال ہو۔☆

''سانحہ ساہیوال'' ایک تسلسل بربریت کا

عابد شکیل فاروقی

ساہیوال میں ہونے والا واقعہ، اگرچہ بربریت اور درندگی کی انتہائی بھیانک شکل سامنے لاتا ہے، لیکن اس پر میرا کچھ کہنا اس سے کچھ بھی زیادہ نہیں ہوگا جو مجھ سے پہلے اس پر کہا جا چکا ہے، جن جن الفاظوں میں اس پر دہائی دی گئی، جس شدت سے اس کی مذمت کی گئی، میں اس سے زیادہ شدت نہیں لا سکتا، کیونکہ جب ایک دس بارہ سال کی معصوم بچی کو اتنے قریب سے گولی ماری جا رہی ہو تو اس پر آپ جس قدر بھی اپنے غصے کا اظہار کریں اس درندگی اور بربریت کا جواب نہیں بن سکتا، اس کا جواب تو صرف ایک ہی صورت میں بن سکتا ہے کہ اس گولی مارنے والے اور اس کا حکم دینے والے کو بھی بالکل اسی انداز سے گولی ماری جائے، یہ ردعمل بحیثیت ایک انسان میری طرح کسی بھی عام انسان کا ہو سکتا ہے، لیکن میں یہاں صرف ردعمل کا اظہار کرنے نہیں بیٹھا ہوں، کیونکہ اس قسم کا ردعمل تو اس قسم کے ہر واقعے پر چند دنوں کے لئے ہوتا ہے، اسکے بعد اس سے کہیں زیادہ کوئی ہولناک خبر بنا دی جاتی ہے، جو دن بھر اس بربریت پر مٹی ڈالنے کی غرض سے ٹی وی چینلز پر چلائی جاتی ہے، اور نہ میں اس وقت یہاں اس واقعے کی گتھیاں سلجھانے کے لئے یہ کالم لکھنے بیٹھا ہوں، کیونکہ اس قسم کے جن واقعات کے پس پشت ریاستی اداروں کی غفلت یا غیر پیشہ ورانہ طرز عمل ہو تو اس کی گتھیاں سلجھائی نہیں بلکہ مزید الجھا دی جاتی ہیں جیسے اس سانحے کے ساتھ کیا جا رہا ہے بلکہ میں تو اس وقت یہ سوچ رہا ہوں کہ اس قسم کے رد عمل اور غصے کا اظہار کر کے کیا ہم اس قسم کی درندگی کا جواب دے سکتے ہیں، کیونکہ یہ واقعہ اس ملک میں پہلا واقعہ نہیں ہے بلکہ اگر میں اس ملک کی تاریخ اٹھا کر دیکھوں تو ہمارے ملک کی تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہے، جس میں کچھ تو غیر دانستگی میں اور غیر پیشہ وارانہ طرز عمل کے نتیجے میں اس قسم کے ماورائے عدالت قتل کیے جاتے ہیں، جبکہ بعض واقعات میں دانستہ اور ریاستی پالیسی کے تحت عدالتوں سے باہر اس قسم کے ماورائے عدالت قتل کئے جاتے ہیں، جنکی مختصر تفصیل میں مندرجہ ذیل واقعات پیش کرتا ہوں جو خود اپنے اندر اس حقیقت کی غمازی کرتے نظر آتے ہیں کہ کیا یہ واقعات واقعی غیر دانستگی میں ہو جاتے ہیں، کیا ہمارے ملک میں ایک انسانی زندگی اتنی غیر اہم ہے کہ یہ ریاستی ادارے درندوں کی طرح کا عمل کر کے ایک زندہ انسان کو جانور کی طرح ذبح کریں اور ہاتھ جھاڑ کر، پسینہ پوچھ کر مطمئن ہو کر بیٹھ جائیں۔

اس قسم کے واقعات کی شروعات میری معلومات کے حساب سے ایک کمیونسٹ

رہنماء کی ہلاکت سے ہوئی تھی، جب 1960 میں، ایوب خان کی آمرانہ حکومت کے دوران مشہور کمیونسٹ لیڈر حسن ناصر کو قید کے دوران تشدد کر کے ہلاک کیا گیا جنہیں عدالت میں پیش کرنے کی بجائے، جیل کے قید خانے میں ہی تشدد کر کے شہید کر دیا گیا، جبکہ اسی طرح کا ایک اور واقعہ ضیاء کی آمریت کے عرصے میں جام ساقی اور جمال نقوی کے ساتھ قید ہونے والے مشہور کمیونسٹ لیڈر نذیر عباسی کا تھا جنہیں انکے اپنے ہی ساتھیوں کی غداری کی بھینٹ چڑھا دیا گیا اور انہیں بھی عدالت میں پیش کرنے کی بجائے دوران قید تشدد کا نشانہ بنا کر راستے سے ہٹایا گیا جبکہ ایوب خان کی آمریت کے دوران ہی بلوچستان میں کتنے ہی بلوچ حریت پسندوں کو، ٹرائل کا موقع دئے بغیر مار دیا گیا، وہ بھی جو پہاڑوں پر تھے اور وہ بھی جو پہاڑوں سے اتر کر بات چیت کرنے کی نیت سے نیچے آئے اور حکمرانوں کی چالوں کا شکار بنے۔

اس حوالے سے ٹنڈو بہاول کا سانحہ سب سے دل دہلانے دینے والا واقعہ تھا جب 5 جون 1992 سندھ ٹنڈو بہاول کے ایک گاؤں میں ایک حاضر سروس میجر ارشد جمیل کی قیادت میں پاک فوج کے ایک دستے نے نو کسانوں کو گاڑی میں بٹھایا اور جامشورو کے نزدیک، دریائے سندھ کے کنارے لے جا کر گولیاں مار کر قتل کر دیا، ان پر الزام لگایا گیا کہ وہ دہشت گرد تھے اور انکا تعلق بھارتی خفیہ ایجنسی را سے تھا، اس ماورائے عدالت قتل کے خلاف گاؤں کی ایک بوڑھی مائی جندو، جسکے دو بیٹے اور ایک داماد اس واقعے میں ہلاک کر دئے گئے تھے سینہ سپر ہو کر ریاستی اداروں سے ٹکرانے کے لئے میدان میں آئی، اور اس وقت اخبارات اور صحافیوں کی مدد سے طاقتور اداروں سے ٹکرانے کی ٹھانی اور اسکے عزم اور حوصلے کے باعث یہ واقعہ نہ صرف ملکی بلکہ غیر ملکی نشریاتی اداروں کی توجہ کا مرکز بنا، جسکی وجہ سے بالآخر یہ حقیقت سامنے آئی کہ قتل ہونے والے دہشت گرد نہ تھے بلکہ میجر ارشد جمیل کا انکے ساتھ زرعی زمین کا جھگڑا تھا، جسکی سزا میں انہیں قتل ہونا پڑا، بہرحال ان فوجیوں کا کورٹ مارشل ہوا اور میجر ارشد جمیل کو سزائے موت اور تیرہ دیگر فوجیوں کو عمر قید کی سزا ہوئی، مگر انکی طاقتور پہنچ کی وجہ سے اگرچہ ملک کے دو مقتدر ایوانوں سے اسکی رحم کی اپیل مسترد ہونے کے باوجود، ان کی سزا پر عمل درآمد روک دیا گیا، جسکے بعد ارشد جمیل کے بھائی کی اپیل پر سپریم کورٹ نے باقاعدہ اس کی سزا پر عمل درآمد روک دیا، کورٹ کے اس فیصلے کے خلاف مائی جندو کے دو بیٹوں نے 11 ستمبر 1996 کو حیدرآباد پریس کلب کے سامنے خودسوزی کی کوشش کی جسکے نتیجے میں وہ ہلاک ہو گئے، اس ہولناک احتجاج کے سامنے حکمراں مجبور ہو گئے اور 28 اکتوبر 1996 کو ارشد جمیل کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

پھر ایک وقت وہ بھی آیا جب آمروں کی مدد سے تشکیل پانے والی ایم کیو ایم کے خلاف 1992 میں ایک آپریشن ہوتا ہے اور جس میں انہی کے ساتھیوں کی مدد سے چن چن کر ایم کیو ایم کے کارکنوں کو ہلاک کیا جاتا ہے، اگرچہ اس آپریشن کے دوران مرنے والوں کی اکثریت بھی مبینہ طور پر کسی کے قتل میں ملوث تھی لیکن پھر بھی، ماورائے عدالت قتل کی کسی طور بھی حمائت نہیں کی جا سکتی۔

اس کے علاوہ کراچی میں ہونے والے ماورائے عدالت قتل میں سب سے اہم اور مشہو قتل 20 ستمبر 1996 کو ہونے والا میر مرتضی بھٹو کا قتل تھا جس میں انہیں سر عام گولیوں سے بھون دیا گیا، اور قاتل پولیس والوں کی واضح نشاندہی کے باوجود انہیں بری کر دیا گیا۔ اسی طرح 17 مئی 2011 کو کوئٹہ میں ایک ماورائے عدالت کا واقعہ رونما ہوا جس میں مبینہ طور پر پانچ خودکش حملہ آوروں، جسمیں تین عورتیں اور دو مرد شامل تھے، کو خروٹ آباد چیک پوائنٹ کوئٹہ، پر ایف سی کی فائرنگ سے ہلاک کیا گیا، جبکہ سی سی پی او، کوئٹہ دو روز بعد اپنے دفتر میں ایک پریس کانفرنس میں فرماتے ہیں کہ ان خود کش حملہ آوروں کی ہلاکت بم پھٹنے سے ہوئی ہے، جنکے پاس سے خودکش جیکٹس، دستی بم دھماکہ خیز مواد اور اسلحہ برآمد ہوا، لیکن ایسی کوئی چیز میڈیا کے سامنے نہیں لائی گئی بعد میں ان ہلاک شدگان کی لاشوں کی پوسٹ مارٹم کیا گیا تو ان کی رپورٹوں نے سی سی پی او کے دعووں کی تردید کر دی، جسمیں کہا گیا کہ تمام غیر ملکیوں کی ہلاکت گولیاں لگنے سے ہوئی ہیں پانچوں غیر ملکی چیچین تھے اور انہیں زندہ گرفتار کیا جا سکتا تھا لیکن انکو اپنی صفائی کا موقع دئے بغیر گولیوں سے بھون دیا گیا تھا۔ اسی طرح جون 2011 کو رینجر نے ایک معصوم اور بے گناہ نوجوان کو شہید بے نظیر بھٹو پارک بوٹ بیسن کراچی میں سب کے سامنے گولیوں سے بھون دیا، جسکی فوٹیج اس وقت ملک کے ہر چینل پر دکھائی دی جس میں واضح دیکھا جا سکتا تھا کہ وہ نوجوان بالکل غیر مسلح تھا اس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہیں تھا اور چیخ چیخ کر اپنی بیگناہی کی دہائی دے رہا تھا۔

علاوہ ازیں کراچی ہی میں ہونے والے مزید ماورائے عدالت ہلاکتوں میں 2018 میں ہونے والے تین قتل جس میں ایک انتظار احمد کا قتل تھا دوسرا مقصود کا قتل تھا، جنکی ایک سال گزرنے کے باوجود ابھی تک تفتیش مکمل نہیں ہو سکی، اور حسب معمول نہ کبھی ہوگی۔ اسی طرح 12 جنوری 2018 کو نقیب اللہ محسود قتل، جسمیں راؤ انوار نامزد ہونے کے باوجود انوسٹیگیشن کمیٹی کے سامنے پیش ہونے سے انکاری رہے اور پیش نہ ہونے کے باوجود اسکی ضمانت منظور کر لی گئی۔

ابھی فروری 2019 کے آغاز ہی میں بلوچستان کے علاقے لورائی میں پشتون تحفظ موومنٹ کے ایک جلسے کے دوران پی ٹی ایم کے ایک علاقائی رہنماء ابراہیم ارمان لونی کی پولیس تشدد کے نتیجے میں ہلاکت اس سلسلے کی بالکل تازہ مثال ہے جبکہ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ پی ٹی ایم کی تشکیل کے پیچھے بھی کچھ اسی قسم کے عوامل نظر آتے ہیں کہ کن کن حالات میں اس تنظیم کی تشکیل ہوئی وہ کون سے اسباب تھے کہ اس علاقے کے نوجوانوں کو اس تنظیم کے پلیٹ فارم پر مجتمع ہونا پڑا

مندرجہ بالا واقعات تو وہ واقعات تھے جنکی کسی نہ کسی طرح اخبارات نے، یا میڈیا نے

معلومات حاصل کرلیں ، جبکہ اس کے علاوہ بھی ملک بھر میں ایسے کتنے ہی پولیس مقابلے ہوتے ہیں جنکو ورثاء کو اطلاع دئے بغیر ہی نمٹا دیا جاتا ہے، جیسا کہ پچھلے کئی سالوں سے بلوچستان میں بلوچ نوجوانوں ، اور ملک کے دیگر علاقوں سے لبرل اور سیکولر فکر رکھنے والے کارکنوں کو انکے گھروں سے اٹھا کر غائب کر دینا ایک معمول بن گیا ہے، جنکی کوئی اطلاع نہ تو ہمارے میڈیا کو ہوتی ہے اور اگر ہوتی بھی ہے تو اسکو سامنے آنے نہیں دیا جاتا ، انکے بارے میں یہ دعوی کیا جاتا ہے کہ انکے بلوچ علیحدگی پسندوں سے روابط ہیں، یا یہ لوگ ملک کی نظریاتی نظریاتی سرحدوں کے دشمن ہیں لیکن اگر یہ سچ بھی ہے تو انہیں یوں دن دہاڑے گھروں سے اٹھا کر غائب کر دینے کا حق کس نے دیا ہے، کیا وہ عدالت میں پیش نہیں کئے جاسکتے یہی وہ سچائیاں ہیں جس کے بارے میں ہیومین رائٹ واچ نے رپورٹ کیا کہ صرف 2015 کے ایک سال میں ملک بھر میں کل دو ہزار ماورائے عدالت ہلاکتیں ہوئیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں کر ممکن ہے کہ کسی بھی شہری کو چاہے اس نے کتنا ہی بڑے سے بڑا جرم کیا ہو عدالت میں پیش کئے بغیر گولیوں سے بھون کر اسکی ہلاکت کا فرمان جاری کر دیا جائے، کیا یہ انسانی معاشرہ ہے یا جنگلی درندوں کا مسکن ہے جہاں جسکی لاٹھی اسی بھیس کا قانون نافذ ہے، کیا اس ملک میں آئین و قانون ہر شہری کو انصاف کا حقدار نہیں سمجھتا، کیا کسی کو بھی انصاف کے کٹہرے میں لائے بغیر چند طاقتور قوتوں کی مرضی کی بھینٹ چڑھا دیا جانا ہی انصاف ہے، حب الوطنی اور ملک سے محبت کرنیکی تشریح کا حق کسی ایک ادارے کو کس نے دیا ہے بدقسمتی سے اس ملک میں یہی سچ ہے، کڑوا سچ جسے پچھلے ستر سالوں اس قوم کو سہنا پڑھ رہا ہے لیکن کوئی بھی طاقت اس ناانصافی کے آگے کھڑی ہونے کی ہمت نہیں کر پاتی، جس کا نتیجہ پھر کبھی مشرقی پاکستان کی مکتی باہنی کی شکل میں سامنے آتا ہے کبھی بلوچستان میں کئی سالوں سے جاری بدامنی کی شکل میں سامنے آتا ہے، جسکے نتیجے میں وہاں مسلح جتھے پہاڑوں پر مورچہ زن ہوکر یہاں کی مسلح افواج سے دوبدو جنگ کرنے پر مجبور ہوجاتی ہیں، کبھی خیبر پختون خواہ میں پی ٹی ایم کی شکل میں سامنے آتا ہے۔

دراصل اس تمام صورتحال کی کڑیاں اس ملک کے ان اداروں کی کارکردگی سے جڑتی ہیں جنکو اس سرزمین پر شہریوں کی جان و مال کے تحفظ کی ذمہ داریاں سونپی جاتی ہیں ان اداروں میں پولیس اور ان سے جڑے دیگر ادارے ہوتے ہیں، پولیس کا محکمہ کسی بھی ریاست میں قانون کا نفاذ اور معاشرے کو مجرموں سے محفوظ اور انکو گرفت میں لیکر سزا دینے کے لئے قائم کیا جاتا ہے، جس کا فرض ہے کہ وہ عوام الناس کو طاقتور اور جابروں کے ظلم و ستم اور، کمزوروں اور نچلے طبقوں کے شہریوں کو مختلف قسم کی ناانصافیوں سے محفوظ رکھنے کا سامان فراہم کرے، اختیارات کے ناجائز استعمال پر روک کا نفاذ قائم رکھے، یہ فورس مہذب معاشروں اور ترقی یافتہ ریاستوں میں عوام الناس کو اپنی جان و مال کی حفاظت کا احساس دلاتی ہے جس سے عدل و انصاف اور ''جیو اور جینے دو'' کے ماحول کو تقویت ملتی ہے لیکن یہ ادارہ اپنے یہ فرائض تن تنہا ادا نہیں کرسکتا بلکہ اسے اپنا یہ فریضہ ادا کرنے کے لئے، اعلی ترین تربیت یافتہ پیشہ ور سپاہیوں اور مختلف سراغرساں اداروں اور ایجنسیوں کے تعاون کے ساتھ ساتھ انتہائی جدید ہتھیاروں کی ضرورت پڑتی ہے ، اور پھر یہ کہ اس ادارے کی کارکردگی جانچنے کے لئے اس ادارے کو بیرونی دباؤ سے آزاد رکھنا اور ایک بالکل خودمختار حیثیت دینا بھی اتنا ہی اہم ہے۔

لیکن جب ہم اوپر بیان کئے گئے تمام واقعات کا بغور جائزہ لیتے ہیں تو سب سے پہلے تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں زیادہ تر واقعات میں پولیس اور دیگر سیکورٹی ایجنسیاں ملوث ہیں جبکہ چند واقعات میں بالخصوص بلوچستان اور بالعموم سندھ اور پنجاب میں، پولیس کے علاوہ فوج یا اس سے منسلک خفیہ ایجنسیاں براہ راست ملوث نظر آتی ہیں جو شہریوں کو وجہ بتائے بغیر، انکا جرم بتائے بغیر، انکے گھروں یا کہیں سے بھی زبردستی اٹھا کر غائب کر دیتی ہیں، اور کئی کئی مہینوں حتی بعض واقعات میں سالوں انکا کچھ اتا پتہ نہیں دیتیں ان گمشدہ افراد میں سیاسی کارکنان ، جمہوریت اور انسانی حقوق کے تحفظ کی جدوجہد کرنے والے کارکنان شامل ہوتے ہیں اکثر کیسز میں جنکی بازیابی صرف انکی موت کی شکل ہی میں ہوتی ہے۔

پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس ملک میں پولیس کے محکمے کو نہ تو آج تک آزادانہ حیثیت دی گئی نہ اس کو کبھی سیاسی مداخلت سے آزاد رکھا گیا، کیونکہ جس انداز کا سیاسی نظام اس ملک میں رائج کیا گیا اس میں حکمرانوں کو اسی قسم کی پولیس کی ضرورت ہوتی ہے، اس ملک میں حکومتوں کی طاقت انکی اپنی سیاسی ساکھ اور عوام میں انکی بنیادوں اور قبولیت کی بجائے ، ملک کے اس قسم کے محکموں پر انکا اثر نفوذ میں ہوتی ہے ہر حکمران ان اداروں کی طاقت کی بنیاد پر ہی اپنا عرصہء حکمرانی پورا کرتے ہیں، جن سے نہ صرف وہ اپنے سیاسی مخالفوں سے انتقام لیتے ہیں بلکہ انکو قابو میں رکھنے کا کام بھی لیتے ہیں اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہر حکمراں کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ اس ملک کا کوئی ادارہ اتنا مضبوط نہ ہو کہ وہ ان کے کسی حکم سے انکار کرسکیں، چاہے ان کے اس عمل سے ملک کے تمام ادارے اپنے بنیادی فرائض سے کتنے ہی دور نہ ہوجائیں، اور آج اس ملک کے ہر ریاستی ادارے سے عوام کو اگر ڈھیروں شکائتیں ہیں، یا وہ انکی کارکردگی سے غیر مطمئن ہیں تو اس وجہ یہی ہے۔

کیا ایک مہذب اور جدید جمہوری ملک میں ایسا غیر قانونی، غیر آئینی، غیر جمہوری، غیر انسانی سلوک روا رکھنے کی اجازت دی جاسکتی ہے، جس میں کسی بھی شہری کو اس کا جرم بتائے بغیر پابند سلاسل کیا جاسکے، یہ کہاں کا انصاف ہے، کہ ایک شہری کو چاہے وہ کتنا ہی بھیانک مجرم ہی کیوں نہ ہو عدالتی و قانونی حق اور صفائی کا موقع دیئے بغیر سزا دے دیجائے اور ایسا عمل کرنے والوں کو کوئی پوچھ ہی نہ سکے نہ کوئی ان سے جواب مانگ سکے

مندرجہ بالا بیان کئے گئے واقعات میں دو عنصر نمایاں نظر آتے ہیں انمیں واقعات کی ایک قسم وہ ہے جن میں پولیس یا کسی بھی لاء انفورسمنٹ ایجنسی کی غفلت یا غیر پیشہ ور طرز عمل کا مظاہرہ نظر آتا ہے، جن میں مبینہ طور پر یا سرکاری بیانات کی حد تک غلطی سے ہلاکتوں کا اعتراف کیا جاتا ہے، اور پھر ان واقعات کو اس طرح نمٹایا جاتا ہے کہ نہ تو اصل مجرموں کا سرغ ملتا ہے اور نہ کبھی ان کو سزا ملتی ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہے کہ اصل مجرموں کو تحفظ دینے کے لئے ہی انکو منوں مٹی تلے دبا دیا جاتا ہے ان کے اس طرز عمل سے محسوس یہ ہوتا ہے کہ اس ملک کے تمام ادارے اس ملک کے عوام کی خدمت کے لئے نہیں بلکہ انہیں لوٹنے کیلئے قائم کئے گئے ہیں، اور اس عمل میں وہ اس حد تک طاقتور اور بے خوف ہو گئے ہیں کہ اب ان میں انسان اور جانور کی تفریق کا بھی احساس ختم ہو چکا ہے ۔

تاریخ میں ہم یہی پڑھتے آئے ہیں کہ کہ کسی بھی ریاست کی سپاہ (مسلح افواج) اس ریاست کے حکمران یا بادشاہوں کے احکامات کی تابع ہوتی ہیں، تاریخ سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ راشد حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ حاکم وقت کی حکم عدولی کے باعث اپنے سپہ سالار حضرت خالد بن ولیدؓ کو ان کے عہدے سے نہ صرف برطرف کر دیا تھا بلکہ انہیں انکے محاز سے واپسی کا حکم دیکر خلیفہء وقت کے روبرو پیش ہونے کا حکم صادر فرمایا تھا، اس واقعے کا حوالہ دینے کا مقصد صرف یہ ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ ریاست کا حکمراں ہی سب سے اعلی اتھارٹی ہوتی ہے کاروبار ریاست کو چلانے کے لئے، اور اپنی ذمہ داریاں سنبھالنے کے ساتھ ہی ہر ادارے کے چھوٹے سے چھوٹے اور اعلی ترین اہلکار کو یہ حلف اٹھانا ہوتا ہے کہ وہ ہر حالت میں وقت کے حکمراں کا وفادار رہے گا اور اس کے ہر حکم کی بجا آوری اس کا اولین فرض ہوگا، یہی عمل ایک مثالی طریقہ حکمرانی کی ضمانت ہوتا ہے، چاہے یہ حکمران ایک جدید سرمایہ دارانہ سماج کا حکمران ہو یا کسی سوشلسٹ ریاست کا حکمران ہو، ریاستی اداروں کا مروجہ قوانین کا پابند رہنا ہی کسی ریاست کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ لیکن اس ملک پاکستان میں مسلح ادارے بزعم خود اپنی حکومت خود تشکیل دیتے ہیں وہ کسی اعلی ترین اتھارٹی کو جواب دہ نہیں سمجھتے، جس میں سب سے طاقتور ادارہ اس ملک کی فوج ہے جسکے جنرلز اپنے آپ کو کسی کے آگے جواب دہ نہیں سمجھتے وہ اپنے آپکو حکومت وقت کی پالیسیوں کے تابع نہیں سمجھتے، وہ اپنی پالیسیاں خود تشکیل دیتے ہیں، اگر انکی پالیسیوں کے نتیجے میں ملک میں کچھ بہتری کے آثار نظر آئیں تو وہ انکا کریڈٹ لیکن اگر انکی پالیسیوں کے نتیجے میں کچھ منفی شواہد نظر آتے ہوں تو اس کے ذمہ داری سیاسی حکومتوں کے کھاتے میں ڈالدی جاتی ہے، یہی وہ اقرار نامہ ہوتا ہے جس کو مانتے ہوئے سیاسی حکومتیں اقتدار حاصل کر پاتی ہیں، کیونکہ وہ ان عناصر پر مشتمل ہوتی ہیں جو طاقتور حکمراں طبقوں کی نمائندگی کے لئے ایوانوں میں بھیجے جاتے ہیں جو اپنی طاقت کا عملی مظاہرہ ان سویلین اداروں میں غیر ضروری مداخلت کی شکل میں کرتے ہیں، اس بیجا مداخلت ہی ایک شکل پولیس کے محکمے میں طاقتور حکومتی اراکین کی من مانیاں ہوتی ہیں جنکے نتیجے میں پولیس کا محکمہ اپنی پیشہ وارانہ قابلیت سے دور ہو کر، اسی قسم کی کارکردگی دکھاتا ہے جو اوپر بیان کئے گئے بے شمار ماورائے عدالت قتل کے واقعات کی شکل میں دنیا کے سامنے آتی ہیں۔ اور جنکو روکنے یا ان پر کسی بھی قسم کی روک لگانے کے لئے ضروری ہے کہ اس ملک میں عوام کی حکمرانی کے حق کو تسلیم کیا جائے، عوامی نمائیندگی کے سب سے معتبر اور اعلیٰ ترین ادارے پارلیمنٹ کی توقیر اور عزت کی جائے اس کے بنائے ہوئے قوانین کو عملاً نافذ کیا جائے تمام ریاستی اداروں کو انکی حد میں رہنے کا پابند کیا جائے، ایک دوسرے کی حد میں مداخلت سے باز رکھا جائے، ملکی دستور اگرچہ اس سلسلے میں بڑی وضاحت کے ساتھ ہر ادارے کی آئینی حد کی تشریح کرتا ہے اور اس حد کی خلاف ورزی کی . صورت میں اس کے خلاف کاروائی کرنے کی سفارش بھی اسی آئین میں درج ہے، جن پر عمل کرنا ہی اس ملک کی بقا کا ضامن ہے، لیکن کیا آئین میں دی گئی ان تمام ضمانتوں نے عملا اس ملک کے جملہ سیاسی، جمہوری و آئینی مسائل کا کبھی حل دیا، نہیں دیا کیونکہ یہ آئین جس جمہوری و سیاسی نظام کی دین ہے وہ عوام کا نظام ہے ہی نہیں، اس نظام نے جب بھی تحفظ دیا عوام کے اوپری پرت کو تحفظ دیا جن کی حکمرانی کو کبھی خطرہ ہی نہیں رہا، یہ وہ طبقہ ہے جو مختلف شکلوں میں اپنا حق حکمرانی حاصل کر ہی لیتا ہے، کبھی پیپلز پارٹی کی شکل میں، کبھی نون لیگ کی شکل میں کبھی، قاف لیگ کی شکل میں، کبھی پی ٹی آئی کی شکل میں اور کبھی غیر سیاسی حکومتوں میں اپنا حصہ وصول کر کے ،انہیں غرض صرف ایوان اقتدار میں اپنے حصے کے حصول سے ہے، انہیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ آخر اس ملک کے عوام کی اس گلے سڑے اور ناانصافی پر مبنی نظام حکومت سے کب جان چھوٹی گی کب ان کے حقیقی بنیادی مسائل مستقل بنیادوں پر حل ہونگے، جو ظاہر ہے اس نظام حکومت میں ممکن نہیں ہے، اس کے لئے ایک ایسے سیاسی وسماجی نظام کی ضرورت ہے جس میں عوام کے حقیقی نمائندوں کے ہاتھوں میں اس ملک کی باگ ڈور آئیگی، جب ایک تعلیم یافتہ غریب شہری بھی اس ملک کے تقدیر کے فیصلے کرنے میں خود کو شریک سمجھے گا عوام کے سب سے نچلے طبقے کلرک، ڈاکٹر، وکلاء، انجینئر، کسان، مزدور، کاروباری حضرات میں سے پڑھے لکھے تعلیم یافتہ شہری پارلیمنٹ میں جانے میں آزاد ہوں، انہیں بھی قانون سازی میں عملا شرکت کرنے کا موقع ملے، کیونکہ جب عوام کے ان طبقات کے لوگ پارلیمنٹ میں پہنچیں گے جنہیں ان مسائل کا ادراک ہو، ان سے عملا متاثر ہوں وہی عوام کے مسائل کے حل کرنے میں قادر ہونگے، اس مقصد کے لئے اس ملک کے نظام سیاست میں بنیادی تبدیلیاں لانی ہونگی، جو ایک انقلابی پروگرام اور نظریہ رکھنے والی پارٹی ہی لاسکتی ہے، موجودہ سیاسی پارٹیاں جو عملا عوام کی پارٹیاں ہی نہیں ہیں ان سے ان تبدیلیوں کی توقع رکھنا ایسا ہی عمل ہے جیسے ہم پچھلے ستر سالوں سے کرتے چلے آرہے ہیں، اور جنکے نتائج تو یہ قوم پچھلے سالوں سے بگھتی چلی آرہی ہے، جنکے ہوتے ہوئے عوام کے مسائل کبھی بھی حل نہیں ہوسکیں گے ۔ ☆

چہرے نہیں نظام کو بدلو۔۔۔۔۔۔لوٹ کھسوٹ کے راج کو بدلو

محمد جعفر۔ ہری پور

میں آپ کی توجہ تربیلہ ڈیم کے ان متاثرین کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں جنہیں آج تک ڈیم کے متاثرین کی صف میں شامل ہی نہیں کیا گیا، یہ یونین کونسل کالنجر اور یونین کونسل لدڑ منگ پر مشتمل علاقہ تناول کا قطعہ ہری پور سے شمال مشرق میں دربند چھپر روڈ کے گردونواح میں واقع اپ سٹریم متاثرین ہیں۔اس علاقہ کا زیادہ تر رقبہ پہاڑی بنجر اور بارانی ہے۔لوگ چھوٹے چھوٹے قطعات اراضی کے مالک ہیں جس سے پیدا ہونے والی زرعی پیداوار خاندان کی کفالت کے لئے کافی نہیں ہوتی۔تعلیم اور ہنر کے فقدان کے باعث لوگ دور دراز شہروں میں ہوٹلوں، کارخانوں، پکوان سنٹروں میں روزانہ اجرت پر کام کرنے کے لئے ہجرت پر مجبور ہیں۔جہاں اگر چہ وہ بارہ اور چودہ گھنٹے ناگفتہ بہ حالت میں کام کرتے ہیں مگر علاج معالجہ، سوشل سکوریٹی اور بڑھاپا الاؤنس جیسی سہولیات سے محروم ہیں۔یہ لوگ قانون نافذ کرنے والے اداروں کی کرپشن، حکومت کی بے حسی، سیاسی و مذہبی جماعتوں کی مال بنانے کی ہوس اور لوٹ مار کا مال بیرون ملک منتقل کرنے کی دوڑ میں مصروف ان نام نہاد عوامی نمائندوں کے کالے کرتوت سب کچھ برداشت کرنے پر مجبور ہیں

تربیلہ ڈیم کی تعمیر سے جہاں ملکی سطح پر ترقی کے عمل کو آگے بڑھانے میں مدد ملی ہے وہاں اس علاقے کے باشندوں کو صدیوں پیچھے دھکیل دیا گیا ہے۔اس کے گردونواح میں واقع زرخیز زرعی زمین زیر آب آ گئی۔آباواجداد کی قبریں ڈوب گئیں۔ہری پور شہر تک کا فاصلہ 15 کلومیٹر سے بڑھ کر ساٹھ سے نوے کلومیٹر ہو گیا۔اور کرایہ سوا روپیہ سے 150 روپے سے زائد تک بڑھ گیا۔اس علاقے کو ضلعی ہیڈ کوارٹر، صوبائی ہیڈ کوارٹر اور ملک کے دیگر شہروں سے ملانے والی فرنگی دور کی واحد سڑک زیر آب آنے کے باعث 18 سال تک یہ علاقہ ملک کے دیگر حصوں سے کٹا رہا۔خشکی کا راستہ نہ ہونے کی وجہ سے لوگ خاص طور پر خواتین اور بچے دلدل میں دھنس دھنس کر ذلیل وخوار ہوتے رہے۔18 سال کے بعد جو متبادل سڑک بنائی گئی وہ دشوار گذار پہاڑی سلسلوں سے گذرتی ہے۔زگ زیگ کی طرح چکراتی اس خطرناک سڑک پر اذیت ناک سفر طے کرنا پڑتا ہے۔جب کہ روزمرہ کے استعمال کی اشیاء کی ٹرانسپورٹیشن اور کرایوں کی مد میں لوگ ابھی تک کروڑوں روپے کا تاوان برداشت کر چکے ہیں۔

جبکہ اس روڈ کی امپرومنٹ کے لئے ہر جنرل الیکشن سے پہلے سیاستدان وعدہ کرتے ہیں لیکن اقتدار میں آتے ہی ان کی ترجیحات بدل جاتی ہیں یہی نہیں بلکہ طبی سہولیات کے حوالے سے اس علاقے کی صورتحال ناگفتہ بہ ہے۔شہر سے دور دراز دشوار گذار سفر اور ناقص ذرائع آمدورفت کے باعث صورتحال اس وقت مزید سنگین ہو جاتی ہے جب زچگی کی صورت میں مریضہ راستے ہی میں دم توڑ دیتی ہے۔ایک غیر سرکاری تنظیم سیو دی چلڈرن(Save the children) کی معاونت سے علاقے میں ہسپتال کی عمارت تعمیر ہوئے کئی سال بیت گئے ہیں اور ہسپتال میں فراہم کردہ سرجری کے آلات اور مشینری زنگ آلود ہوئے جا رہے ہیں لیکن ارباب اختیار نے تاحال کوالیفائیڈ عملہ تعینات نہیں کیا۔

سیاسی رہنماؤں نے پارٹیاں بدل بدل کے بڑی بڑی مسندیں پائیں۔اس علاقے سے تعلق رکھنے والوں میں راجہ سکندر زمان بجلی اور پانی کے وزیر رہے، گوہر ایوب خان وزیر خارجہ اور قومی اسمبلی کے سپیکر رہے، پیر صابر شاہ صوبائی وزیر اعلیٰ اور وزیر اعظم کے مشیر رہے، سردار مشتاق قومی اسمبلی کے ممبر اور بجلی اور پانی کی سٹینڈنگ کمیٹی کے چیئرمین رہے، فیصل زمان جہازوں والا دوبار صوبائی اسمبلی کے ممبر اور ڈی ڈیک کمیٹی کے چیئرمین رہے۔آج بھی پیر صابر شاہ ن لیگ کے سینیٹر، تحریک انصاف کے اکبر ایوب خان مواصلات کے صوبائی وزیر اور عمر ایوب خان بجلی اور پانی کے مرکزی وزیر ہیں۔

سیاسی اکابرین نے اس علاقے کو ترقی کے عمل میں ہمیشہ نظر انداز رکھا۔اس علاقے کی بدقسمتی یہ رہی کہ صوبائی اور قومی اسمبلی میں موثر نمائندگی نہ ہو سکی۔اس علاقے کے منتخب نمائندوں کی مجرمانہ غفلت کے باعث علاقے کے مکین آج کے اس روشن اور ترقی یافتہ دور میں بھی اپنے بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے سے قاصر ہیں۔کتنے دکھ کی بات ہے کہ اس جدید سائنسی دور میں جہاں لڑکیاں لڑکوں کے دوش بدوش اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی ہیں وہاں یونین کونسل کالنجر اور لدڑ منگ کی لڑکیوں اور لڑکوں کیلئے اعلیٰ تعلیم کے دروازے بند ہیں۔یعنی اس علاقے کے بچوں کا مستقبل تاریک ہو جاتا ہے۔جبکہ عوامی نیشنل پارٹی کے دور حکومت میں گورنمنٹ عبدالولی خان ڈگری کالج کے نام سے بلڈنگ تعمیر ہو چکی ہے، گورنمنٹ گرلز ہائر سیکنڈری سکول کی عمارت بھی موجود ہے لیکن منافقانہ سیاسی

ذہنیت رکھنے کے باعث عرصہ دراز سے کلاسوں کے اجراء سے گریز کیا جارہا ہے۔
یہی نہیں بلکہ براعظم ایشیا کی سب سے بڑی جھیل کے کنارے آباد یہ بدنصیب مخلوق پینے کے صاف پانی اور صحت وصفائی کی بنیادی سہولیت سے بھی محروم ہیں۔

حکومت نے تربیلہ ڈیم کی کروڑوں روپے کی رائیلٹی ضلع ہری پور کے لئے مختص کی تھی لیکن سیاسی نمائندے اس رقم کی بندر بانٹ کر لیتے ہیں۔ رائلٹی کی یہ خطیر رقم حقداروں کی ترقی تک پہنچنے کے بجائے گروہی سیاست کے فروغ کے بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ ہم پاکستانی شہری ہونے کے ناطے باعزت زندگی گذارنے کا حق چاہتے ہیں۔ ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ تربیلہ ڈیم کی رائلٹی کی رقم حقدار متاثرین کی بحالی اور ترقی کی مد میں خرچ کرنے کو یقینی بنانے کے اقدامات کئے جائیں۔ اور رائلٹی کی رقم سے ترجیحی طور پر متاثرہ علاقے میں پینے کے صاف پانی، تعلیم، صحت، اور روزگار کے مواقع فراہم کئے جائیں۔

☆طویل اور دشوار گذار سفر کو کم کرنے کے لیے سید پور جم کے مقام پر پل تعمیر کیا جائے۔
☆متاثرہ یونین کونسل کے باسیوں کے کاندھوں سے مالی بوجھ کم کرنے کے لئے بجلی کے 100 یونٹ کا بل ڈیم کی رائیلٹی سے ادا کیا جائے۔
☆ڈگری کالج اور گرلز ہائیسکینڈری سکول میں فی الفور کلاسز کا اجراء کیا جائے۔
☆RHC کو اپ گریڈ کر کے کوالیفائیڈ سٹاف کے ساتھ فنکشنل کیا جائے۔
☆ویٹنری ڈسپنسری صوابی میرا کو اپ گریڈ کر کے ہسپتال کا درجہ دیا جائے۔
☆یونین کونسل کی سطح پر ووکیشنل سنٹر، پروفیشنل اور فنی ادارے قائم کئے جائیں۔
☆علاقے کے نوجوانوں کے لئے اعلیٰ تعلیم اور ملازمتوں کے لئے کوٹہ مخصوص کیا جائے۔
☆نوجوانوں کو مثبت تفریح کے مواقع فراہم کرنے کے لئے کھیل کے گراؤنڈ تعمیر کئے جائیں۔
☆یونین کونسل کالنجر میں زراعت کے فروغ کے لئے سمال ڈیم اور ڈگ ویل کے ذریعے آبپاشی کا انتظام کیا جائے۔
☆زرعی سروسز کی فراہمی کے لئے زرعی سنٹر کا قیام عمل میں لایا جائے۔ جہاں بیج، کھاد، ٹریکٹر تھریشر رعایتی ریٹ پر مہیا کئے جائیں۔
☆یونین کونسل میں موجود ڈسٹرکٹ کونسل کے موجود راستوں سے تجاوزات ختم کر کے فارم سے مارکیٹ روڈ تعمیر کئے جائیں۔
☆لوئر تناول کے مرکزی مقام کالنجر یونین کونسل میں کمپیوٹرائزڈ قومی شناختی کارڈز کے اجراء کے لئے نادرہ کا فرنچائز آفس قائم کیا جائے۔

چھوڑیں گے نہ ہم کوشش تعمیر نشیمن.....گرتی ہے اگر برق تو سو بار گرے

اقتدار نے تحریک کو ختم کر دیا اور انصاف مل نہیں رہا۔ عابد حسن منٹو
سویلین معاملات میں بڑھتی ہوئی ملٹریزایشن کو روکا جائے۔ اختر حسین
بلوچستان سمیت ملک کے دیگر علاقوں میں فوجی آپریشن بند کئے جائیں۔ یوسف مستی خان

لاہور (پ ر) عوامی ورکرز پارٹی کی فیڈرل ایگزیکٹو کمیٹی کا ایک روزہ اجلاس لاہور میں عابد حسن منٹو کے دفتر میں منعقد ہوا۔ اجلاس کی صدارت یوسف مستی خان صدر عوامی ورکرز پارٹی نے کی۔ اجلاس کے آغاز میں پارٹی کے مرحوم صدر فانوس گوجر کی اچانک وفات پر ایک منٹ کی خاموشی اختیار کی گئی۔

اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے عابد حسن منٹو بانی صدر عوام ورکرز پارٹی نے کہا کہ اقتدار نے تحریک کو ختم کر دیا ہے اور انصاف مل نہیں رہا۔ عوام شدید پریشان ہیں لوگوں کی امیدیں پوری ہوتی نظر نہیں آرہیں۔ تحریک انصاف حکومت کو خود سمجھ نہیں آرہی کہ کیا کیا جائے۔ ہم سول اداروں کی بالادستی ہر حال میں رکھنا چاہتے ہیں۔ فوجی عدالتوں کو جاری رکھنا درست نہیں دیگر فوجی عدالتوں کا مقصد صرف سزا ہی دینا ہے تو پھر عدالتیں بنانے کا کوئی جواز نہیں ویسے ہی سزائیں دے دیں۔ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے عوامی ورکرز پارٹی کے جنرل سیکرٹری اختر حسین نے کہا کہ سویلین معاملات میں بڑھتی ہوئی ملٹرائزیشن کے عمل کو روکا جائے۔ فوجی افسران کے سول اداروں میں تعینات نہ کیا جائے اور فوجی اداروں کو دفاعی معاملات تک محدود کیا جائے وہ داخلہ اور خارجہ امور کو نہ چلائیں یہ جن کا کام ہے ان کو کرنے دیا جائے۔ اجلاس سے صدر یوسف مستی خان نے کہا کہ بلوچستان سمیت ملک کے دیگر علاقوں میں جاری اعلانیہ اور غیر اعلانیہ دونوں طرح کے فوجی آپریشن بند کئے جائیں۔ کراچی میں ناجائز تجاوزات گرانے کے نام پر لاکھوں افراد کو بے روزگار کیا گیا ہے اور بزنس تباہ کر دیئے گئے ہیں۔ عدالتیں انسانی پہلو سے آنکھیں چرا کر جو فیصلے کر رہی ہیں ان کو بہانہ بنا کر بیوروکریسی عوام دشمن رویہ اپنائے ہوئے ہے۔ کراچی کے نواحی علاقوں میں بڑے سرمایہ داروں نے مقامی آبادی سے زمینیں اونے پونے داموں زبردستی خرید کر لوٹ مار کا جو بازار گرم کر رکھا ہے اسے بند کیا جائے۔

اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے فاروق طارق ترجمان عوامی ورکرز پارٹی نے کہا کہ پی آئی اے اور دیگر اداروں میں ٹریڈ یونینوں پر غیر اعلانیہ پابندی کی شدید مذمت کرتے ہیں۔ پرائیویٹ سیکٹر کو ماضی میں بھی بے شمار مراعات دی گئی تھیں وہ معاشی ترقی کرنے سے قاصر رہا ہے۔ اب ایک دفعہ پھر زور وشور سے نیولبرل ایجنڈا پر عملدرآمد ہو رہا ہے

اورریاستی اداروں کوسرمایہ داروں کے حوالے کرنے کی منصوبہ بندی جاری ہے۔ ایکسپورٹ کوبڑھانے کے نام پرروپیہ کی35فیصد قیمت گرانے سے ہر چیز مہنگی ہوگئی ہے۔مہنگائی کے تناسب سے محنت کش عوام کی تنخواہوں میں اضافہ کیا جائے۔

اجلاس میں اِس بات پراتفاق کیا گیا کہ 18 ویں ترمیم میں تبدیلی اوراس کوختم کرنے کی ہر سازش کی مخالفت کی جائے گی۔ میڈیا پر نئی پابندیوں کوختم کیا جائے۔میڈیا کارکنوں کی چھانٹیاں روک کران کودوبارہ ملازمت پر بحال کیا جائے۔دریاؤں اورڈیلٹا کی بحالی کے لیےمطلوبہ مقدرمیں پانی ڈاؤن سٹریم چھوڑا جائے۔گلگت بلتستان کے بارے میں فیصلہ وہاں پرمقیم عوام کوبااختیار بنا کر ہی کیا جاسکتا ہے۔ اس خطے کے فیصلے پاکستان میں کرنے کی بجائے مقامی اداروں اورعوام کوبااختیار کیا جائے۔اجلاس کے شرکاء نے مطالبہ کیا کہ بابا جان اوران کے ساتھیوں کوفوری رہا کیا جائے۔میسور،شمالی وزیرستان میں فوجی جبر بند کیا جائے۔گھروں میں داخل ہونا بند کیا جائے۔ اوکاڑہ ملٹری فارمز اور دیگر پبلک فارمز کے مزارعین رہنماؤں کے خلاف جھوٹے مقدمات فوری ختم کئے جائیں۔مہرعبدالستاراوردیگرکوفوری رہا کیا جائے۔

اجلاس میں اس بات پراتفاق کیا گیا کہ قریبی ہمسایہ ممالک بھارت، ایران، افغانستان،چین کے ساتھ ویزا سسٹم کی بجائے ویزا آن آرائیول سسٹم (انٹری سسٹم) کورائج کیا جائے۔عوام کوایک دوسرے سے براہ راست ملنے کی راہ میں رکاوٹیں ختم کی جائیں۔سارک ممالک کاملتوی اجلاس فوری منعقد کیا جائے۔

اجلاس نے وینزویلا کی منتخب حکومت کوامریکی سامراج کی جانب سے ختم کرنے کی کوششوں کی شدید مذمت کی گئی اور مطالبہ کیا گیا کہ وینزویلا میں سامراجی مداخلت فوری بند کی جائے۔

اجلاس میں طے کیا گیا کہ ملک بھر میں محنت کش طبقات کے حقوق کے دفاع میں تحریک کا آغاز کیا جارہا ہے جس کے دوران لاہور، اسلام آباد، کوئٹہ، پشاور، کراچی، حیدرآباداورملتان میں بڑے جلسہ عام منعقد کئے جائیں گےاور بائیں بازو کے متبادل بیانیہ کوعوامم کے سامنے پیش کیا جائے گا۔سرمایہ داری جاگیرداری نظام کے خاتمےاورسوشلسٹ معاشرہ کی تحریک کوجاری رکھا جائے گا۔

اجلاس سے خطاب کرنے والوں میں عصمت شاہ جہاں، ڈاکٹر عاصم سجاد اختر، ڈاکٹر بخشل تھلو، ڈاکٹر خالد ہمایوں، جاوید اختر، شازیہ خان، عابدہ چوہدری، انجینئر حیدرزمان،صفدرسندھو،ظفراقبال ایڈووکیٹ اوردیگرشامل تھے۔

جاریکردہ: فاروق طارق۔ترجمان عوامی ورکرز پارٹی0300-8411945

عوامی ورکرز پارٹی کی ملک بھر میں جاری سیاسی سرگرمیوں پر ایک نظر

(ترتیب وتدوین: عابد شکیل فاروقی)

اے ڈبلیو پی کے جنرل سیکریٹری اختر حسین نے 10 جنوری 2019 کو پورٹ قاسم کے محنت کشوں کے دھرنے میں شرکت کی اوران سے مکمل یک جہتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انکے مطالبات کی حمایت کی اوران سے انکی جدوجہد میں بھرپورتعاون کا یقین دلایا۔

اے ڈبلیو پی بلوچستان کے ایک وفد نے 12 جنوری 2019 کو پرانی بی ایم سی کالونی، بنوری روڈ کوئٹہ کا دورہ کیا اورخواتین کے شمولیتی پروگرام تحت،علاقے کی نمائندہ خواتین کو پارٹی کی ممبرشپ تفویض کی۔

اے ڈبلیو پی کے مرحوم صدرکامریڈ فانوس گوجر کے چہلم کے موقع پر 13 جنوری 2019 کو بونیر کے مقام، ریال میں ایک بہت بڑا اجتماع اور جلسہ عام کا انعقاد کیا گیا،جسمیں خیبر پختون خواہ، پنجاب،سندھ گلگت بلتستان اور کشمیر سے سینکڑوں افراد نے شرکت کی جلسے سے صدرعوامی ورکرز پارٹی یوسف مستی خان، جنرل سیکریٹری اختر حسین، پارٹی ترجمان فاروق طارق، نائب صدرعابدہ چوھدری، صوبائی صدورشہاب خٹک، عاصم سجاد اختر،سندھ نیشنل کمیٹی کے سیکریٹری یونس راہو، کے پی کے پارٹی کے سیکریٹری حیدرزمان، بونیر ضلع کے سیکریٹری میزاللہ خان، پنجاب سے غلام دستگیر محبوب، برطانیہ سے پارٹی کے رہنما ذاکر حسین، جموں وکشمیر پارٹی رہنما نثار شاہ، مزدورکسان پارٹی کے جناب افضل خاموش ، کے ساتھ ساتھ دیگر مرکزی،صوبائی اور علاقائی رہنماؤں نے خطاب کیا، چہلم میں اے این پی اورقومی وطن پارٹی کے مرکزی رہنماؤں نے بھی شرکت کی، مقررین نے کہا کہ اس وقت غیر جمہوریت پسند اورانتہا پسند قوتوں کے غیر جمہوری عزائم کے مقابلے میں، تمام ترقی پسند، جمہوریت پسند،اورسیکولر قوتوں کے اتحاد کی سخت ضرورت ہے مقررین کی جانب سے، فانوس گوجر کے انقلابی مشن کے ساتھ تجدید عہد کرتے ہوئے اس عزم کا اظہار کیا گیا، کہ مظلوم عوام کے حقوق کے تحفظ کی جنگ جاری رہے گی،سرمایہ داری اور جاگیرداری کے خلاف جدوجہد کواور تیز کیا جائے گا

اے ڈبلیو پی بادہ یونٹ کی جانب سے پارٹی کے مرحوم صدرکامریڈ فانوس گوجر کے چہلم کے موقع پر مورخہ 13 جنوری 2019 کوایک تعزیتی اجلاس کا انعقاد کیا گیا، اجلاس سے پارٹی کے صوبائی نائب صدراثر امام، لاڑکانہ پارٹی کے ضلعی

نائب صدر مجیب پیرزادہ، احمد علی نوناری اور گلزار چنا نے خطاب کیا ۔

سندھ پروگریسو کمیٹی کے بینر تلے 20 جنوری 2019 کو سانگھڑ میں تیل، گھی، گیس ،دواؤں اور دیگر اشیائے خورد ونوش کی قیمتوں میں اضافے اور بڑھتی ہوئی مہنگائی کے خلاف ایک احتجاجی مظاہرے کا انعقاد کیا گیا، جسمیں شہریوں کی ایک بڑی تعداد کے علاوہ عوامی ورکرز پارٹی کے ضلعی عہدداروں اور پارٹی کارکنوں نے بھرپور شرکت کی۔

اے ڈبلیو پی پنجاب کی صوبائی کمیٹی ایک اجلاس مورخہ 20 جنوری 2019 کو لاہور میں منعقد ہوا، اجلاس میں تنظیمی امور اور صوبے میں آئیندہ ضلعی کانگرسوں کے انعقاد کے لئے مشاورت انکی تاریخوں اور شیڈول کا فیصلہ کیا گیا، مزید برآں ملک کی سیاسی صورتحال کا جائزہ لیا گیا، ساہیوال میں پولیس گردی کی شدید الفاظ میں مذمت کی گئی، اجلاس میں ملک میں ہوشربا مہنگائی، بیروزگاری، کے خلاف اور بجلی گیس کے بلوں میں اضافے پر شدید تشویش کا اظہار کیا گیا۔

اے ڈبلیو پی لاہور کی جانب سے 26 جنوری 2019 کو، جعلی پولیس مقابلوں، ریاستی اداروں کی دہشت گردی کے خلاف اور سانحہ ساہیوال کے متاثرین سے اظہار ہمدردی، انکو فوری انصاف مہیا کرنے، اور ملزمان کو فوری منظر عام پر لانے کے لئے لاہور پریس کلب کے سامنے ایک مظاہرے کا انعقاد کیا گیا، جس میں پارٹی کے کارکنان ڈیرہ سہگل کے ساتھیوں کے علاوہ دیگر سیاسی کارکنان نے بڑی تعداد میں شرکت کی اور اس حوالے اپنا احتجاج رکارڈ کرایا۔

اے ڈبلیو پی بونیر کا ضلعی اجلاس صاحبزادہ باچہ کی رہائش گاہ پر 27 جنوری 2019 کو منعقد ہوا، جس میں عوامی ورکرز پارٹی مالاکنڈ دویژن کے صدر عثمان فانوس گوجر، ضلع بونیر کے صدر گل رحمٰن، سیکریٹری آمیز اللہ خان، اور دیگر اہم رہنماؤں نے شرکت کی، اجلاس میں ضلع میں آئندہ کی سیاسی سرگرمیوں کے حوالے سے اہم فیصلے کئے گئے۔

اے ڈبلیو پی اسلام آباد نے یکم فروری 2019 پارٹی کے مرحوم صدر کامریڈ فانوس گوجر کے اعزاز میں ایک تعزیتی ریفرنس کا انعقاد کیا گیا، جسمیں پارٹی کے بانی صدر کامریڈ عابد حسن منٹو نے خصوصی طور شرکت کی، جبکہ دیگر مقررین میں عصمت شاہجہاں، فرزانہ باری، مرتضی سولنگی، عثمان فانوس گوجر اور حیدر علی، شامل تھے جنہوں نے جناب فانوس گوجر کی جدائی کو پارٹی کے لئے ایک بہت بڑا نقصان قرار دیا۔

اے ڈبلیو پی بادہ کی جانب سے شہر میں پینے کے پانی کی قلت کے خلاف یکم فروری 2019 کو احتجاج ریکارڈ کرایا گیا اس موقع پر سندھ کے نائب صدر کامریڈ اثر امام ،سندھ کے جنرل سیکریٹری کامریڈ یونس راہو، ضلعی صدر ذوالفقار بروہی، ضلعی نائب صدر کامریڈ مجیب پیزادہ، ضلعی سیکریٹری اطلاعات کامریڈ اسرار نوناری، نے میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ بے حس حکمراں عوام کے مسائل سے لاتعلق بنے بیٹھے ہیں انہوں نے کہا کہ بادہ کے شہری خاص طور پر پرانی بادہ، زکریا کالونی، درگاہ شریف محلّہ شیخ محلّہ سمیت اکثر محلوں میں پینے کے پانی کی سخت قلت ہے۔

میڈیا ورکرز کی بیروزگاری کے خلاف میڈیا ورکرز ایکشن کمیٹی کے زیر اہتمام، کراچی کے مختلف مقامات پر جاری دھرنوں اور احتجاجی مارچ میں عوامی ورکرز پارٹی کے مرکزی رہنماؤں نے پارٹی وفود کے ساتھ شرکت کی جن میں مرکزی صدر یوسف مستی خان، جنرل سیکریٹری کامریڈ اختر حسین پارٹی کے مرکزی سیکریٹری تعلیم وتربیت، کامریڈ صبا الدین صبا، صوبائی سیکریٹری مالیات عابد شکیل فاروقی، ضلعی صدر کامریڈ عثمان بلوچ ضلعی سیکریٹری اطلاعات کامریڈ حسن جاوید، نمایاں تھے ان رہنماؤں نے ان دھرنوں اور مارچ سے خطاب کیا، اور صحافیوں کی جائز جدوجہد پر انکو خراج عقیدت پیش کیا، ان رہنماؤں نے پنی جانب سے پیشہ وارانہ خدمات اور سیاسی حمایت کا یقین دلایا۔

12 فروری 2018 بروز منگل، عوامی ورکرز پارٹی، تحصیل گاگرہ کا ایک تنظیمی اجلاس ضلعی دفتر میں منعقد ہوا، جس میں تنظیمی امور، آئندہ کا لائحہ عمل، اور متعدد امور زیر بحث لائے گئے اور تحصیل گاگرہ کی تنظیمی سازی بھی مکمل کی گئی، جس میں گاگرہ تحصیل کا صدر طالع مند خان، سینئر نائب صدر شبیر، نائب صدر بختی شاہ، سیکریٹری جہانزیب، ڈپٹی سیکریٹری نثار احمد، فنانس سیکریٹری موسیٰ گوجر، سیکریٹری اطلاعات کامریڈ سعید، لیبر سیکریٹری تاجر، کسان سیکریٹری اشبر اور یوتھ سیکریٹری ذریت خان منتخب کئے گئے۔

اے ڈبلیو پی سندھ اور بابا جان رہائی تحریک سندھ کی جانب سے 17 فروری 2019 کو کراچی پریس کلب کے سامنے پارٹی کے ضلعی صدر کامریڈ عثمان بلوچ کی قیادت میں ایک احتجاجی مظاہرہ کیا گیا، جس میں سینکڑوں کی تعداد میں سیاسی کارکنان، طلباء اور شہریوں نے شرکت کی، مظاہرین نے مطالبہ کیا کہ، بابا جان اور انکے 15 ساتھیوں کو رہا کیا جائے، عوامی حقوق کے لئے پرامن جدوجہد کرنے کی پاداش میں گزشتہ سات سال سے قید بابا جان کو ان کے دل کے عارضے کے علاج کے لئے فوری طور پر اسلام آباد میں دل کے ہسپتال میں منتقل کیا جائے۔

اے ڈبلیو پی خیبر پختون خواہ کی نیشنل کمیٹی کا ایک اجلاس 18 فروری 2019 کو مردان میں منعقد ہوا، اجلاس کی صدارت صوبائی صدر کامریڈ شہاب خٹک نے کی ، اجلاس میں اہم سیاسی موضوعات وتنظیمی لائحہ عمل پر بحث کی گئی، اجلاس میں اس عزم کا اظہار کیا گیا کہ پارٹی اپنا تاریخی انقلابی کردار ادا کرتے ہوئے محکوم قومیتوں اور مظلوم طبقات کے حقوق کی جنگ میں ثابت قدمی سے اپنا کردار ادا کرتی رہے گی۔

برطانیہ میں رہائش پزیر ہندوستانی اور پاکستانی ترقی پسندوں کی جانب سے نریندر مودی حکومت کی جانب سے فوجی حملوں کی مذمت اور دونوں ممالک سے تحمل سے کام لینے کی اور ہر قسم کی فوجی کارروائی سے باز رہنے کی درخواست کی گئی، اس سلسلے میں عوامی ورکرز پارٹی برطانیہ کے پروفیسر محسن ذوالفقار، پرویز فتح، انڈین کمیونسٹ پارٹی مارکسسٹ، ساؤتھ ایشین پیپلز فورم، انڈین ورکرز ایسوسی ایشن برطانیہ اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے رہنماؤں نے مشترکہ بیان میں کہا کہ دونوں ممالک اپنے مذہبی جنونیوں کو لگام دیں اور برصغیر کو جہنم بنانے سے باز آجائیں۔ ☆

انٹرنیشنل ورکنگ ویمن ڈے کے موقع پر عوامی ورکرز پارٹی لاہور کے زیر اہتمام ایک پروگرام

عوامی ورکرز پارٹی اسلام آباد کے زیر اہتمام پارٹی کے مرحوم صدر کامریڈ فانوس گجر کی یاد میں تعزیتی ریفرنس

انٹرنیشنل ورکنگ ویمن ڈے کے موقع پر اے ڈبلیو پی لاہور میں ریلی کا انعقاد

انٹرنیشنل ورکنگ ویمن ڈے کے موقع پر اے ڈبلیو پی فیصل آباد میں ریلی کا انعقاد

ہم گنہگار عورتیں

کشور ناہید

یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں
جو اہلِ جبہ کی تمکنت سے نہ رعب کھائیں
نہ جان بیچیں
نہ سر جھکائیں
نہ ہاتھ جوڑیں
یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں
کہ جن کے جسموں کی فصل بیچیں جو لوگ
وہ سرفراز ٹھہریں
نیابتِ امتیاز ٹھہریں
وہ داور و اہلِ ساز ٹھہریں
یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں
کہ سچ کا پرچم اُٹھا کے نکلیں
تو جھوٹ سے شاہراہیں اٹی ملی ہیں
ہر ایک دہلیز پر سزاؤں کی داستانیں رکھی ملی ہیں
جو بول سکتی تھیں وہ زبانیں کٹی ملی ہیں
یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں
کہ اب تعاقب میں رات بھی آئے
تو یہ آنکھیں نہیں بجھیں گی
کہ اب جو دیوار گر چکی ہے
اسے اُٹھانے کی ضد نہ کرنا
یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں
جو اہلِ جبہ کی تمکنت سے نہ رعب کھائیں
نہ جان بیچیں
نہ سر جھکائیں
نہ ہاتھ جوڑیں

○